اِنۡ اُرِيۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

ماہنامہ

# البرہان

لاہور

دسمبر ۲۰۱۳ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ **البرہان** لاہور

جلد ۱۷، شمارہ ۱۲، دسمبر ۲۰۱۳ء/صفر المظفر ۱۴۳۵ھ


## مشمولات


**O فکر و نظر**

غلامی سے نجات — مدیر — ۴

**O شذرات**

فرقہ واریت کا عفریت — مدیر — ۵

**O تعلیم و تربیت**

علامہ شبلیؒ کے تعلیمی افکار — ظفر الاسلام اصلاحی — ۶

جنسی تعلیم کی آڑ میں گھناؤنی سازش — ڈاکٹر سلیم بشیر — ۱۵

**O تزکیۂ نفس**

تصوف ـ افراط و تفریط کی زد میں — مدیر — ۱۹
تصوف کی خرابیوں سے بدک کر تزکیۂ نفس سے تغافل جائز نہیں

**O اسلام اور فکر مغرب**

آئن سٹائن کی بے عقلی — ڈاکٹر محمد امین — ۲۳

مولانا وحید الدین خاں ـ ایک فکری جائزہ — سید خالد جامعی — ۲۸

**O اسلام اور پاکستان**

دینی رسالوں کو ہائیڈ پارک نہیں بننا چاہیے — فصیح احمد — ۳۷
مولانا زاہد الراشدی صاحب کی خدمت میں چند گزارشات

غلبۂ اسلام بذریعہ احتجاجی سیاست — محمد رشید — ۴۷
تنظیم اسلامی کی خدمت میں چند گزارشات

فکر و نظر

# غلامی سے نجات

البرہان کا ایک بڑا ہدف امت کو مغرب کی فکری غلامی سے نجات دلانا ہے اور ہم سے اس ضمن میں جو بن پڑتا ہے ہم اس سے دریغ نہیں کرتے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ جب تک ہم لَآ اِلٰهَ پر عمل نہیں کرتے اِلَّا اللّٰہ کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں ان سارے ذرائع کا استعمال ضروری ہے جن سے مسلمانوں کی صحیح ذہن سازی ہو سکے (جیسے تعلیم اور میڈیا) یا ان کے فکر و عمل پر اثر انداز ہوا جا سکے (جیسے سیاسی، معاشی اور معاشرتی شعبوں کی پالیسیاں)۔

اس حوالے سے ہم ان افراد، اداروں اور تحریکوں کی تائید کرنا اپنا دینی فرض سمجھتے ہیں جو دین کے کسی بھی شعبے میں تعمیری کام کر رہے ہیں اور مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب کی تخریب کو ردّ کرنے کے حوالے سے کوئی سی بھی جدو جہد کر رہے ہیں اور وہ لوگ تو بہت ہی عظیم ہیں، ان کو ہمارا سلام، جو مغربی طاغوت کی جارحیت اور بالا دستی کا مقابلہ کرنے کے لیے جہاد کر رہے ہیں اور اپنے لہو کا نذرانہ اللہ کے حضور پیش کر رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ہم ان افراد، اداروں، تحریکوں اور حکومتوں کی مذمت کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں جو اس الحادی تہذیب کے گن گاتے ہیں، مسلم معاشرے میں اس کی ترویج کے خواہاں اور اس کے لیے کوشاں ہیں یا اپنے قلیل دنیوی مفاد کے لیے ان کے گماشتے کا کردار ادا کرنے میں مشغول ہیں۔

اے اللہ! ہمیں امریکی غلامی سے نجات دلا۔

شذرات

# فرقہ واریت کا عفریت

اس موضوع پر ہم نے پچھلے مہینے بھی قلم اُٹھایا اور پہلے بھی کئی بار لکھا لیکن حکومت چونکہ صحیح سمت میں قدم نہیں اٹھا رہی لہٰذا فرقہ واریت کا عفریت قابو نہیں آ رہا بلکہ دن بدن بے قابو ہوتا جا رہا ہے۔ راولپنڈی کا سانحہ ہوا، پہلے بھی بہت سے سانحات ہوئے اور اب تو ہلاکتوں اور ٹارگٹ کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا ہے۔ ہمارے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ بلاشبہ شیعہ سنی اختلاف موجود ہے اور ان میں کچھ انتہا پسند و متعصب عناصر بھی موجود ہیں۔

۲۔ شیعہ سنی میں عموماً اشتعال اور نفرت کی فضا موجود نہیں، نہ علماء کی سطح پر اور نہ عوام کی سطح پر۔ یہ ہمارا اندازہ نہیں ملی مجلس شرعی کے پلیٹ فارم پر کام کرنے کی وجہ سے ہمارا تجربہ اور مشاہدہ بھی ہے۔

۳۔ شیعہ سنی کو لڑانے والے امریکہ و بھارت اور ان کے حلیف ہیں جنہوں نے بے شمار مالی اور افرادی قوت اس محاذ پر لگا رکھی ہے اور ممکن ہے بعض مسلم ممالک بھی اس میں شامل ہوں۔

۴۔ سابقہ حکومتوں کی طرح ہماری موجودہ حکومت بھی امریکہ کی غلام ہے لہٰذا وہ اپنی عقل سے سوچ ہی نہیں سکتی اور نہ اپنے قومی وملی مفادات کا تحفظ کر سکتی ہے۔ امریکہ و بھارت اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں لیکن یہ ان کو دوست قرار دیتی ہے اور ان سے دوستی نبھانے پر مصر ہے۔ قوم کچھ کہتی ہے، سیاسی جماعتیں اور پارلیمنٹ کی قراردادیں کچھ اور کہتی ہیں لیکن ہماری حکومت نہ امریکہ اور اس کے حلیفوں کی ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' (جو دراصل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ ہے) سے باہر آتی ہے نہ امریکہ و بھارت سے یہ کہنے کی جرأت کرتی ہے کہ فرقہ واریت کے نام پر یہ دہشت گردی بند کرو، اور نہ اس کے پس پشت مسلم ممالک کو شٹ آپ کال دیتی ہے۔

ہم پھر کہتے ہیں کہ یہ فرقہ واریت نہیں، فرقہ واریت کے نام پر دہشت گردی ہے جس کے پیچھے بیرونی ہاتھ ہے۔ عوام، علماء کرام اور سیاسی جماعتوں کو چاہیے کہ وہ حکومت پاکستان کو مجبور کریں کہ وہ اس بیرونی ہاتھ کو روکے اور کچلے اور اگر یہ اس کے بس کی بات نہیں تو یہ لوگ گھر چلے جائیں اور علماء و عوام ان کو زبردستی گھر بھیجیں۔ علماء کرام کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اعتدال و رواداری کے فروغ اور بین المسالک ہم آہنگی و اتحاد کے لیے جدوجہد کریں اور اپنے اندر کے انتہا پسند و فرقہ پرست عناصر کی سرکوبی کریں اور انہیں Diswon کریں تاکہ فرقہ واریت کے عفریت پر قابو پانے میں مدد مل سکے۔

تعلیم و تربیت

ظفر الاسلام اصلاحی ☆

# علامہ شبلی کے تعلیمی افکار

مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم (۱۹۳۷ء ۔ ۲۰۰۸ء) کی دارالمصنفین سے شائع شدہ آخری کتاب ''مسلمانوں کی تعلیم'' اپنے موضوع پر نہایت عالمانہ و محققانہ مطالعہ ہے۔ اس میں اسلامی تاریخ کے اوّلین ادوار میں مسلمانوں کی شاندار علمی روایات، اسلام اور تعلیم نسواں، مسلمانوں کا قدیم طرز تعلیم اوراس میں اصلاح کے امکانات، موجودہ دور میں دینی مدارس کی اہمیت و معنویت، مسلمان اور عصری تعلیم کے تقاضے، دعوت دین اور مدارس دینیہ کی ذمہ داریاں اور علامہ شبلی کے تعلیمی افکار جیسے اہم موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے علامہ شبلی کے تعلیمی نظریات کے بعض نہایت اہم پہلو راقم کے سامنے آئے۔ اس کے مباحث کی روشنی میں اور بعض دیگر کتب سے استفادہ کرتے ہوئے موجودہ دور میں علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کی معنویت اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ دراصل مولانا مرحوم کی ایک وقیع علمی خدمت کے حوالہ سے انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کی ایک ادنیٰ کاوش ہے۔

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء۔ ۱۹۱۴ء) برصغیر ہندو پاک کی ان نامور شخصیات اور ممتاز دانشوروں میں شامل ہیں جن کی زندگی کا بیش تر حصہ ملی وقومی فلاح و بہبود کے کاموں میں بسر ہوا اور جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کا بہترین مصرف انہی کاموں کو سمجھا۔ مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے مسائل میں تعلیم کے مسئلہ میں علامہ شبلی نے خاص دلچسپی دکھائی۔ انہوں نے تعلیم کو خصوصی اہمیت اس وجہ سے دی کہ میرے بزرگ و مربی ورتقریباً نصف صدی تک علامہ شبلی کی سب سے قیمتی یادگار دارالمصنفین کی بے لوث خدمت انجام دینے والے مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کے الفاظ میں ''ان کے نزدیک یہی قوم کی وقعت و عظمت کا پہلا زینہ ہے، اس سے اس کی ذہنی، دماغی اور اخلاقی تربیت ہوتی ہے اور اسی کی بدولت اس کو ایسے لائق و قابل افراد ملتے ہیں جو اسے قعرِ مذلت سے نکال کر بام عروج تک پہنچا دیتے ہیں۔'' (۱)

مولانا مشرقی تعلیم میں رچے بسے تھے، عصری علوم پر بھی ان کی نظر تھی، مدارس اور جدید تعلیمی اداروں کو بہت قریب سے دیکھنے، ان کے نظام کو گہرائی سے سمجھنے اور ان کے نصاب و طرز تدریس کا بغور جائزہ لینے کا موقع ملا تھا۔ وہ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر مسلسل غور وفکر کرتے رہتے۔ وہ جہاں جاتے قدیم وجدید دونوں قسم کے اداروں کے نظام تعلیم و تربیت سے واقفیت حاصل کرنے میں بڑی دلچسپی لیتے،

---

☆ ڈائریکٹر ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، انڈیا

ان کی خوبیوں وخرابیوں کا پتہ لگاتے اور اصلاح کے امکانات کی نشاندہی کرتے۔ اس طرح تعلیم کے مسائل پر ان کی نظر بڑی وسیع و گہری تھی اور اس ضمن میں جو افکار و خیالات انہوں نے پیش کیے وہ ان کے وسیع مطالعہ، طویل تجربے، تعلیمی منظر نامہ کے گہرے مشاہدے کے نتائج تھے، ان کے تعلیمی افکار کا ایک مختصر مطالعہ پیش نظر ہے اور اس مضمون میں خاص طور سے اس پہلو کو اجاگر کیا جائے گا کہ مسلمانوں کی تعلیم کے مقاصد کے باب میں ان کا کیا نقطۂ نظر تھا اور ان مقاصد کے حصول کے لیے انہوں نے کیا لائحہ عمل پیش کیا۔

علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کے تفصیلی مطالعہ سے پہلے ان کے کچھ اہم نکات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے جو موجودہ دور میں بھی بڑی اہمیت وافادیت کے حامل ہیں۔

☆ مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ ہر شخص کا انفرادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ براہ راست ان کی ملی زندگی اور اجتماعی مسائل سے وابستہ ہے۔ اس لیے ان کی تعلیم و تربیت کے اہتمام میں اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

☆ قدیم و جدید دونوں تعلیم کی ضرورت وافادیت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن موجودہ صورتِ حال میں دونوں میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

☆ جدید علوم وفنون کی اشاعت اور عصری تعلیم کے پروان چڑھتے ہوئے ماحول میں دینی تعلیم کی اشاعت، توسیع اور استحکام کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے تاکہ دینی علوم کے ماہرین کثیر تعداد میں پیدا ہوسکیں اور وہ ملی و اجتماعی مسائل کے حل میں کارگر و مفید ثابت ہوں۔

☆ قدیم و جدید تعلیم میں اس طور پر اصلاح درکار ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں کچھ عصری علوم کے مضامین شامل کیے جائیں اور مسلمانوں کی عصری تعلیم گاہوں میں اسلامیات کی تدریس کا نظم قائم ہو۔

☆ دینی تعلیم کے ساتھ جس جدید مضمون کی تعلیم سب سے زیادہ ضروری ہے، وہ انگریزی زبان ہے اس لیے کہ اس کے بغیر اسلام پر مغربی اسکالرز اور جدید دانشوروں کے اعتراضات سے واقفیت ہوسکتی ہے اور نہ ان کے جواب کی اہلیت پیدا ہوسکتی ہے۔ نیز اسلام سے متعلق انگریزی میں صحیح و مستند لٹریچر کی تیاری کے لیے بھی اس زبان کی مہارت ضروری ہے ورنہ جدید تعلیم یافتہ حضرات میں اسلام و اسلامی تعلیمات کے مطالعہ کی طلب رکھنے والے دوسروں کے تیار کردہ لٹریچر پر انحصار کریں گے اور ان کے سامنے اسلام و اسلامی شریعت کی صحیح ترجمانی نہیں ہو پائے گی۔

☆ تعلیم کا ایسا نظام وضع کیا جائے کہ مختلف فنون کی اختصاصی تعلیم کا اہتمام ہو اور طلبہ اپنی دلچسپی

اور رجحان کے مطابق ان میں سے کسی ایک میدان کو منتخب کر سکیں اس لیے کہ متخصصین کی ضرورت دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔

☆ طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے اور ان کی قوت استدلال کو تیز کرنے کے لیے درسی تعلیم کے ساتھ انہیں بحث ومباحثہ کا عادی بنایا جائے جیسا کہ قدیم طرز تعلیم میں رائج تھا۔

☆ قدیم تعلیم کی بڑھتی ہوئی ضرورت وافادیت کے باوجود مسلمانوں کو ایسے تعلیمی نظام کی زیادہ ضرورت ہے جس میں اسلامیات کا حصہ غالب ہو اور بقدر ضرورت کچھ عصری مضامین کی تعلیم کا بھی اہتمام ہو۔

☆ قدیم وجدید دونوں طرح کی تعلیم کا دائرہ کار الگ ہے۔ دونوں تعلیم کے فیض یافتگان میں اجنبیت کم کرنے اور تال میل پیدا کرنے کی ضرورت ہے تا کہ دونوں مل کر مسلمانوں کی اجتماعی ضروریات پوری کر سکیں اور ان کی فلاح وبہبود کے کاموں میں ایک دوسرے کو تعاون دے سکیں۔

علامہ شبلی کے تعلیمی افکار کس حد تک عصری تقاضوں کے آئینہ دار ہیں، اس کا ہلکا سا اندازہ ان کے اس تاثر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اب یہ بات مختلف فیہ نہیں رہ گئی کہ جدید تعلیم ضروری ہے کہ نہیں۔ اگر کوئی اس ضرورت کا انکار کرتا ہے تو اس کی بات قابل توجہ نہیں۔ اس لیے کہ بدلے ہوئے حالات اور جدید دور کے ابھرتے ہوئے مسائل کے تحت یہ ضرورت امر مسلم بن چکی ہے۔ اس سے انکار امر بدیہی سے انکار ہوگا(۲)۔

اب رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کے لیے قدیم تعلیم ضروری ہے کہ نہیں۔ اس سوال کے جواب میں انہوں نے تین سوالات اٹھائے ہیں جو بڑے اہم ہیں اور انہی کے غور وفکر میں اصل سوال کا جواب مضمر ہے۔ یعنی قدیم تعلیم بھی ضروری ہے اس لیے کہ اس میں مذہبی تعلیم لازمی عنصر کے طور پر ہے اور اس کے بغیر مسلمانوں کی تعلیم مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ سوالات یہ تھے:

۱۔ کیا مسلمانوں کی قومیت مذہب کے سوا کچھ اور ہے؟

۲۔ اگر نہیں تو مذہب کے قیام کے بغیر ان کی قومیت کیوں کر قائم رہے گی؟

۳۔ اگر مذہب کی ضرورت ہو تو مذہبی تعلیم قدیم تعلیم کے بغیر کیوں کر ممکن ہے(۳)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا تھا کہ اگر انگریزی یا جدید تعلیم کے ساتھ کچھ مذہبی تعلیم شامل کر دی جائے تو کیا اس سے مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہو جائے گا۔ اس کا جواب انہوں نے اس طور پر دیا کہ

مسلمانوں کے یہاں تعلیم کے اہتمام سے مقصود اسلامی علوم کا تحفظ، اسلامی عقائد و احکام کی تشریح و ترجمانی اوران پر اعتراضات کے ازالہ کی صلاحیت پیدا کرتا ہے اور محض جزوی طور پر دینی تعلیم سے اس اہلیت کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ وہ دوٹوک انداز میں یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا اس قدر تعلیم سے قرآن و حدیث کی حفاظت ہوسکتی ہے، کیا اس درجہ تعلیم یافتہ اسلام کے مشکل مسائل کی تشریح کر سکتے ہیں، دوسرے کیا اس قدر تعلیم پائے ہوئے لوگ امام، خطیب و مفتی کے فرائض انجام دے سکتے ہیں اور کیا عوام پر ان کا کوئی مذہبی اثر قائم ہوسکتا ہے (۴)۔

اس سے یہ صاف وواضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی قدیم تعلیم کا بہت ہی وسیع تصور رکھتے تھے اور مسلمانوں کے لیے ایسے نظام تعلیم کے قیام کے خواہاں وکوشاں تھے جس سے فیض اُٹھانے والے اسلامی و مشرقی علوم کے ماہر ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ دینی تعلیم یا مدارس کا جو نظام چل رہا تھا وہ اس سے مطمئن تھے اوراس میں کسی اصلاح وترمیم کی ضرورت نہیں محسوس کرتے تھے۔ اس باب میں ان کا تاثر یہ تھا کہ ''قدیم تعلیم میں سخت اصلاح واضافہ کی ضرورت ہے لیکن افسوس ہے کہ بڑے بڑے مقدس علماء اب تک اس ضرورت کے قائل نہیں''، ہم ان سے ان سوالات کے جواب چاہتے ہیں:

☆ یورپ کے مصنفین مذہب پر جو حملے کررہے ہیں اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہے کہ نہیں؟

☆ اگر علماء خود ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے تو کیا انگریزی خواں مسلمانوں میں ان خیالات کا شائع ہونا کوئی روک سکتا ہے؟

☆ مذہب پر عموماً اور مذہب اسلام پر جو اعتراضات یورپ کے لوگ کررہے ہیں ان کا جواب دینا کس کا فرض ہے؟

☆ علماء جب تک ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے جواب کیوں کر دے سکیں گے۔

☆ کیا علماء سلف نے یونانیوں کا فلسفہ نہیں سیکھا تھا اوران کے اعتراضات کے جواب نہیں دیے تھے؟ اگر اس وقت اس زمانہ کا فلسفہ سیکھنا جائز تھا تو اب کیوں جائز نہیں (۵)۔

آخر میں علامہ شبلی نے خود ہی فرمایا کہ ان سوالات کا جواب اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ تعلیم قدیم کے ساتھ جدید خیالات سے واقف ہونے اور انگریزی زبان اور انگریزی علوم پڑھنے کی ضرورت ہے۔ دینی مدارس کے فارغین یا علماء کے لیے انگریزی زبان کی بخوبی واقفیت کو وہ اس پہلو سے بھی ضروری سمجھتے تھے کہ موجودہ صورت حال میں اسلامیات پر اچھے مستند لٹریچر کی ضرورت بڑھ گئی ہے۔ اس لیے

اب مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اشاعت کو کوئی روک نہیں سکتا۔ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی قرآن و حدیث کو جاننے و سمجھنے کا شوق رکھنے والے اور اسلامی احکام سے واقفیت کی طلب رکھنے والے کم نہیں ہیں، جب انہیں مسلم اسکالرز کی تیار کردہ کتابیں نہیں ملیں گی تو دوسروں سے اپنا شوق بجھائیں گے۔ قرآن کریم سمجھنے کا شوق ہوگا تو سیل (Sale) کا ترجمہ پڑھیں گے، فقہ اسلامی جاننا چاہیں گے تو ہملٹن (Hamilton) کے ترجمہ ''ہدایہ'' پر انحصار کریں گے۔ پھر اس صورت پر علامہ نے چبھتا ہوا تبصرہ فرمایا ہے کہ اب نئے تعلیم یافتوں کی مذہبی واقفیت کا مدار انگریزی کی کتابوں اور اسلامی کتابوں کے ترجمہ پر رہ جائے گا تو اس وقت ہمارے مذہبی علوم کی کیا حالت ہوگی۔ دوسرے یہ سوال بھی اُٹھایا کہ کیا یہ کام علماء کا نہیں ہے کہ وہ انگریزی میں مفید اسلامی لٹریچر تیار کریں(۶)۔ یہاں ندوۃ العلماء کے نصاب میں انگریزی زبان کی تعلیم کی شمولیت پر مولانا سید سلیمان ندوی کے سوال اور علامہ شبلی کے جواب کو نقل کرنا بہت برمحل معلوم ہوتا ہے۔ ''حیاتِ شبلی'' کے مصنف تحریر فرماتے ہیں:

> غالباً ۱۹۰۸ء کی بات ہے میں نے مولانا سے عرض کیا کہ عربی کے ہر طالب علم کو انگریزی پڑھنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے مثلاً جو لوگ فقیہ بننا چاہتے ہیں ان کو انگریزی کیا کام آئے گی؟ فرمایا عجیب بات کہتے ہو۔ اگر فقہاء انگریزی جانتے اور ہمارے فقہ کو انگریزی میں منتقل کر سکتے تو ہدایہ وغیرہ کے انگریزوں اور غیر مسلموں کے کیے ہوئے غلط سلط ترجمے آج عدالتوں میں سند نہ قرار پاتے(۸)۔

یہ بات بڑی اہم ہے کہ دینی تعلیم کے نصاب میں اصلاح و ترمیم کی سخت ضرورت کرنے کے باوجود مولانا شبلی برملا یہ فرماتے تھے کہ موجودہ شکل میں (یعنی بدوں اصلاح و ترمیم) بھی مدارس کی تعلیم افادیت سے خالی نہیں۔ اس لیے کہ مذہبی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ دیہات کے مسلمانوں میں احکام اسلام کا پھیلانا خود ایک بہت بڑا کام ہے، جس کے لیے سیکڑوں علماء و واعظین کی ضرورت ہے۔ امامت، خطابت وفتویٰ نویسی کے لیے بھی بہت سے باصلاحیت افراد درکار ہیں۔ یہ سب کام قدیم تعلیم یافتہ حضرات ہی انجام دے سکتے ہیں۔ اس لیے تقسیم کار کے اصول کی رو سے یہ امور انہی کے ہاتھوں میں رہنے چاہئیں، ان کی اعانت و تعظیم کی جانی چاہیے اور کسی صورت میں دینی تعلیم والوں کو بے کار نہیں سمجھنا چاہیے(۹)۔

مدارس میں انگریزی زبان کی معقول تعلیم کے علاوہ علامہ شبلی نے ان اداروں کی تعلیم کو مزید مفید و کارگر بنانے کے لیے اس پر زور دیا کہ ہندی و سنسکرت، جدید فلسفہ اور علوم طبیعہ کی کتابیں بھی داخل نصاب کی جائیں اور انہوں نے ندوۃ العلماء میں اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی۔ ان سب کے علاوہ ان کی یہ رائے بھی بہت اہم تھی کہ نئی صورتِ حال کے تحت مدارس میں طریق تعلیم و تدریس کو

تبدیل کیا جائے۔ جدید دور کے تقاضوں کی روشنی میں طلبہ کو نئے علوم سے بھی روشناس کرایا جائے اور نظام تعلیم کی دوئی کو ختم کر کے قدیم صالح اور جدید نافع کے امتزاج کے طریقہ کو اپنایا جائے (۹)۔

علامہ شبلیؒ نے تعلیم کے اعلیٰ مرحلہ میں اختصاص (Specialization) کے پہلو پر خاص زور دیا۔ یعنی مختلف فنون میں علیحدہ علیحدہ اختصاصی تعلیم کا اہتمام کیا جائے تاکہ مختلف فنون کے ماہرین پیدا ہوں اور اپنے متعلقہ فن میں نمایاں خدمت انجام دینے کے علاوہ ملت کے بھی کام آسکیں۔ ان کا واضح نقطہ نظر یہ تھا کہ تعلیم سے مقصود نفس فن کی تحصیل اور عام سطح سے اُٹھ کر اس میں اختصاص پیدا کرنا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہر فن کے مسائل منفرداً اور مستقلاً حاصل کیے جائیں اور اسی پر توجہ مرکوز کی جائے (۱۱)۔

دراصل یہی طریقہ تعلیم عہد وسطیٰ میں رائج اور بہت مقبول تھا جس کے تحت ہر فن یا مضمون کے استاد سے الگ الگ اس کی اختصاصی تعلیم حاصل کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں ہر فن کے بہت سے متخصصین پائے جاتے تھے (۱۱)۔

اس کے علاوہ انہوں نے طلبہ کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے بحث و مباحثہ اور مناظرہ کے طریقہ کو پسند فرمایا جو قدیم دور میں ہر بڑے بڑے شہر میں منعقد ہوتا تھا۔ مختلف موضوعات پر جداگانہ مجلسیں منعقد ہوتی تھیں جن میں طلبہ وعلماء دونوں شریک ہوتے تھے اور کسی ممتاز عالم کو بحث کے تصفیہ کے لیے حکم کے طور پر منتخب کیا جاتا تھا۔ علامہ شبلیؒ کی رائے میں یہ مباحثے طلبہ کی ذہنی استعداد کو بڑھانے اور قوت استدلال کو مضبوط کرنے میں بڑے موثر اور بعض اوقات نصابی تعلیم سے زیادہ مفید ثابت ہوتے تھے (۱۲)۔

اس لیے جدید دور میں اس روایت کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مزید برآں علامہ شبلیؒ نے درس نظامی کے جن پہلوؤں کی تحسین فرمائی ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اس میں ہر فن یا مضمون کی مشکل یا پیچیدہ کتابیں داخل نصاب ہیں اس کا ایک مفید نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ ان کو سمجھ کر پڑھنے کی وجہ سے طلبہ کی قوت مطالعہ تیز ہو جاتی ہے اور فہم کی استعداد بڑھ جاتی ہے۔ پھر ان کے لیے مشکل سے مشکل کتابوں کو پڑھنا و سمجھنا آسان ہو جاتا ہے (۱۳)۔ گویا کہ علامہ شبلیؒ کی نظر میں مدارس کے نصاب میں ایسی کتابوں کو شامل کرنا مفید ہوگا اور جدید دور میں بھی درس نظامی کے اس پہلو کو اختیار کرنے سے اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔

علامہ شبلیؒ نے جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا قدیم وجدید دونوں اداروں کے نصاب وطرزِ تعلیم میں اصلاح کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ دونوں اداروں کے لوگ اپنے اپنے دائرہ

میں مطمئن ہیں اور اپنے خیال کے مطابق اپنے کو کامیاب سمجھتے ہیں اس لیے نہ تو اصلاح کی طلب ہے اور نہ اس کے لیے کوشش کرتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عصری تقاضوں اور ملی ضروریات کے پیش نظر دونوں کی درسیات میں اصلاح اور طرزِ تدریس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی ضمن میں انہوں نے یہ چبھتا ہوا تاثر بھی ظاہر کیا کہ جدید لوگ اپنے خلاف تنقید سننے پر باآسانی آمادہ ہوجاتے ہیں (۱۴)۔

ان کی نظر میں مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بھی ضروری ہے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر ان کی تعلیم مکمل نہیں ہوسکتی۔ رہا یہ سوال کہ یہ تعلیم کس قدر یا کس نوعیت کی ہونی چاہیے، انہوں نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ظاہر ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے امامت، وعظ وافتاء جیسی مذہبی خدمات مقصود نہیں ہوتی اس لیے جدید تعلیم کے ساتھ اس قدر مذہبی تعلیم کا اہتمام مناسب ہوگا کہ طلبہ بقدر ضرورت شریعت کے مسائل اور اسلام کی تاریخ سے واقف ہوجائیں۔ اس کے لیے بہتر ہوگا کہ ایک مختصر و جامع سلسلہ دینیات مرتب کیا جائے جو مرحلہ وار اسکول سے کالج تک کی کلاسز کے لائق ہو۔ اس کی مزید وضاحت اس طور پر فرمائی کہ انگریزی یا جدید تعلیم کے طلبہ کو عقاید، فقہ اور تاریخ اسلام کی کتابیں پڑھانے کا نظم کا کیا جائے اور اہم بات یہ کہ تعلیم کے مراحل کے اعتبار سے دینیات کی درسیات کی نوعیت واضح کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ اسکول کی کلاسوں میں صرف سادہ عقیدہ، فقہ اور تاریخ اسلام کی تعلیم ہو اور کالج کی کلاسوں میں امام غزالی، ابن رشد اور شاہ ولی اللہ کی منتخب تصنیفات خود عربی زبان میں پڑھائی جائیں اور ان سب کی مجموعی ضخامت سو دوسو صفحات سے زیادہ نہ ہو (۱۵)۔

اس تفصیل سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ شبلی کے ذہن میں جدید تعلیمی اداروں میں دینیات کا مختصر و جامع لیکن انتہائی معیاری نصاب تھا۔ کالج میں دینیات کے نصاب میں امام غزالی، ابن رشد اور شاہ ولی اللہ کی کتابوں کے اقتباسات کا شامل کیا جانا اہمیت سے خالی نہیں ہے۔

کالج کے طلبہ یا جدید تعلیم حاصل کرنے والوں کو مذہبی و اخلاقی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں علامہ شبلی کا یہ نقطہ نظر بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے لیے محض کتابی تعلیم کافی نہ ہوگی۔ صرف دینیات کی کتابیں پڑھانے سے ان میں مذہبی اثر پیدا ہوسکتا ہے اور نہ مذہبی امور کی پابندی ان میں آسکتی ہے۔ ان کی رائے میں اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ:

☆ جدید تعلیم گاہوں میں ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ طلبہ کے چاروں طرف مذہبی عظمت کی

تصویر نظر آئے، ان میں دینی باتوں کی اہمیت جاگزیں ہوجائے اوران میں ان باتوں پر عمل کی رغبت پیدا ہوجائے۔

☆ دینیات کے امتحان کواہمیت دی جائے اوراس کے نتائج کوانگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دیا جائے (غالباً اس سے مراد یہ رہی ہوگی کہ آخری امتحان کے نتیجے میں اس مضمون کے نمبرات بھی محسوس ہوں)۔

☆ کالج میں دینیات کی تدریس کے لیے علماء (یعنی دینیات کے ماہرین) معقول مشاہرہ پر مقرر کیے جائیں۔

☆ کالج میں وعظ وتذکیر کا بھی اہتمام ہواور وعظ کے وقت ارکانِ کالج بھی اپنی موجودگی کو یقینی بنائیں۔

☆ مذہبی امور کی پابندی کرنے والے طلبہ کی تحسین وحوصلہ افزائی کی جائے۔

☆ ان سب پر مزید یہ کہ (جسے علامہ شبلی نے سب سے مقدم کہا ہے) کالج کے سند یافتہ دو چار طلبہ کو وظیفہ دے کران کے لیے دینیات کی اعلیٰ تعلیم کا اہتمام کیا جائے (۱۶)۔ بظاہر اس سے مقصود انہیں مدارس کی تعلیم سے مستفیض ہونے کا موقع فراہم کرنا تھا۔

تعلیم کے دونوں نظام (قدیم وجدید) میں اصلاح وترمیم کے لیے مفید ومناسب تجاویز پیش کرنے کے علاوہ علامہ شبلی نے اس نکتہ پر خاص زور دیا کہ مسلمانوں کو دونوں قسم کی تعلیم درکار ہے۔ دونوں تعلیم کے فیض یافتگان ملت کے ضروری اجزاء ہیں۔ انہیں آپس میں دست و بازو ہوکر کام کرنا چاہیے تاکہ دونوں کی صلاحیتیں اجتماعی مفاد کے کاموں میں صرف ہوں اور دونوں اپنے اپنے طور پر مفید خدمات انجام دے سکیں (۱۷)۔

علامہ شبلی کا یہ نقطۂ نظر بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ دونوں طبقہ کے لوگوں کے میدانِ کار جدا جدا ہیں لیکن دونوں میں دوری کم کرنے اور تال میل پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے لیے بہتر ہوگا کہ طلبہ کو اس طور پر تربیت دی جائے کہ وہ تعصب وتنگ نظری سے دور رہیں، ان میں اپنی برتری کا احساس غالب نہ ہونے پائے۔ ان کی رائے میں اس صورت حال کو بدلنے کی سخت ضرورت ہے کہ قدیم تعلیم یافتہ اور جدید تعلیم کے پروردہ ایک دوسرے کے حریف ومخالف نظر آتے ہیں یا ایک دوسرے کے لیے ایسے اجنبی معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے لیے ایک ساتھ رہنا وتبادلہ خیال کرنا مشکل ہوجاتا ہے (۱۸)۔

ان خیالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ شبلی قدیم وجدید تعلیم میں امتزاج پر بہت زیادہ زور دینے کی بجائے اس بات کو زیادہ اہمیت دیتے تھے کہ دونوں طبقہ کے لوگوں میں ہم آہنگی پیدا ہو اور ربط و تعاون کا ماحول قائم ہو۔ دونوں اپنی حدود میں رہ کر اپنی ذمہ داریاں انجام دیتے رہیں تو اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا اور اختلاف وانتشار بھی کم ہوجائے گا۔ قدیم وجدید تعلیم حاصل کرنے والوں میں ربط وتعاون اور اجتماعی مفاد کے کاموں میں دونوں کی صلاحیتوں بروئے کار لانے سے متعلق علامہ شبلی کے یہ خیالات موجودہ دور میں بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں جب کہ ملی زندگی میں ابھرنے والے نت نئے مسائل کے پیش نظر دونوں تعلیم کے فیض یافتگان کی ضرورت بڑھتی جارہی ہے اور دونوں میں تال میل پیدا کرنے کی کوششیں بھی جاری ہیں۔ (جاری ہے)

## حوالہ جات وحواشی

۱) ضیاء الدین اصلاحی، مسلمانوں کی تعلیم (دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء)، باب ۹: مولانا شبلی کے تعلیمی افکار و نظریات، ص: ۱۳۰

۲) مقالات شبلی (اعظم گڑھ، مطبع معارف، ۱۹۵۵ء)، مقالہ: تعلیم قدیم وجدید، ج: ۳، ص ۱۳۹-۱۴۰

۳) مقالات شبلی، ج: ۳، ص ۱۴۰

۴) ایضاً، ج: ۳، ص: ۱۴۰

۵) ایضاً، ج: ۳، ص: ۱۴۲

۶) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی (اعظم گڑھ، دارالمصنفین، ۲۰۰۶ء)، : ۲۰-۲۱

۷) ایضاً، : ۱۳۵

۸) مقالات شبلی، ج: ۳، ص: ۱۴۲-۱۴۳

۹) اصلاحی، مسلمانوں کی تعلیم، ص: ۱۵۳

۱۰) مقالات شبلی، ج: ۳، ص: ۱۲۹

۱۱) ملاحظہ فرمائیں، ظفر الاسلام اصلاحی، تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں (اعظم گڑھ، دارالمصنّفین، ۱۹۰۷ء)، باب دوم: عہد اسلامی کے ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کے ذرائع، ص: ۴۴-۴۷

۱۲) مقالات شبلی، ج: ۳، ص: ۸۲

۱۳) ایضاً، ج ۳، ص: ۹۹-۱۰۰

۱۴) ایضاً، ج: ۳، ص: ۱۴۰

۱۵) ایضاً، ج: ۳، ص ۱۴۱

۱۶) ایضاً، ج:۳،ص:۱۴۱-۱۴۲

۱۷) ایضاً، ج:۳،ص: ۱۴۳

۱۸) ایضاً، ج:۳،ص:۱۴۳

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر سلیم بشیر☆

# جنسی تعلیم کی آڑ میں گھناؤنی سازش

## وزیر اعظم اور صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور وزرائے تعلیم اور علماء کرام و دینی جماعتیں فوری توجہ فرمائیں

کسی بھی نظریاتی ریاست کی حکومت کی تین بنیادی ترجیحات ہوا کرتی ہیں۔ایک اپنے نظریے کو عوام پر نافذ کرنا، دوسرے اپنے نظریے کو اندرونی اور بیرونی خطرات سے بچانا اور تیسرے اپنے نظریے کو ساری دنیا میں پھیلانا اور منوانا۔رسول کریم ﷺ نے جب مدینہ میں اسلامی نظریاتی ریاست قائم کی تو وہاں اسلامی عقیدے کی بنیاد پر شریعت کو نافذ کیا گیا،اندرونی خطرات سے نمٹنے کے لیے حدُود اللہ کے عدالتی نظام کو نافذ کیا گیا، بیرونی خطرات سے نمٹنے کے لیے جہاد کے ذریعے امت کو مضبوط کیا گیا نیز پھیلاؤ کے لیے دوسری ریاستوں کے حکمرانوں کو وفود اور خطوط بھیجے، تبلیغ اور اقدامی جہاد کے احکام کو اپنایا گیا۔

بد قسمتی سے آج عالم اسلام کے حکمران اور حکومتیں اپنی ترجیحات بدل چکی ہیں، مگر کفر آج بھی انہی تین ترجیہات کو اپنائے ہوئے ہر روز اسلام اور امّتِ مسلمہ کے لئے نئے نئے چیلنجز پیدا کرتا رہتا ہے۔ کفر آج عیسائیت اور صہیونیت کی روائتی یلغار سے ہٹ کر ایک سرمایہ دارانہ عقیدے پر کھڑا ہے جس کی بنیاد زندگی کے تمام نظاموں میں خدا سے آزادی پر ہے۔ان آزادیوں کو ایک خوبصورت نام ''بنیادی انسانی حقوق'' کے نام سے متعارف کرایا جاتا ہے۔ یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسان کے حقوق و فرائض کا تعین اسلام میں تو اللہ رب العزت کرتے ہیں، مگر ان ''بنیادی انسانی حقوق'' کا تعین اپنے عزائم اور مقاصد کو مدِ نظر رکھ کر اپنے نظریئے کے پھیلاؤ کے لئے سرمایہ دارانہ نظریئے کے علم برداروں نے خود کیا ہے۔ ان حقوق میں عقیدے کی آزادی ......اظہارِ رائے کی آزادی......ملکیت کی آزادی......اور شخصی آزادی خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

آج سیکولر ریاستوں میں بالخصوص امریکہ اور یورپ جیسی سرمایہ دارانہ ریاستوں میں عقیدے کی

آزادی کے نام پر اسلام کی مرتد کی سزا کو ظالمانہ قرار دیا جاتا ہے، نیز عقیدے کی اہمیت کو ایک کھلونے سے زیادہ نہیں سمجھا جاتا، جبکہ ملکیت کی آزادی کے نام پر تمام وسائل کو پرائیویٹائز کرنے کے ساتھ ساتھ ترقی

---

☆ saleem.bashir.warriach@gmail.com

پذیر ممالک کے وسائل پر قبضہ کر کے لوگوں کو سرمایہ دار کی معاشی من مانیوں کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ اظہارِ رائے کی آزادی ہمیشہ انبیا کرامؑ اور مذاہب کے مذاق اڑانے کے لئے بے دریغ استعمال کی جاتی ہے اور ساتھ ہی شخصی آزادی کے نام پر جنسی لحاظ سے مادر پدر آزاد معاشرہ (Free Sex Society) بھی قائم کر دیا جاتا ہے۔

اپنی انہی نظریاتی اقدار کو جہاں امریکہ خود نافذ کرتا ہے، وہیں ان کو ساری دنیا میں پھیلانے اور منوانے کے لئے اقوام متحدہ، آئی ایم ایف، اور ورلڈ بنک جیسے اداروں کو استعمال کرتا ہے۔ بندوق سے کیے جانے والے حملوں کو تو نظریاتی اور غیر نظریاتی ریاستیں بندوق سے روکتی ہیں مگر جب حملے ثقافتی، نظریاتی، معاشی اور سیاسی نوعیت کے ہوں تو غیر نظریاتی ریاستیں ہمیشہ مجبور اور بے کس ہونے کے علاوہ کچھ نہیں کر پاتیں۔ پھر عصری تقاضوں کی مجبوری، دنیا کی ساتھ مل کر چلنے کی مجبوری، سپر پاور کے رچائے ڈراموں میں الجھنے کی مجبوری، پتھر کے دور میں دھکیلے جانے کے ڈر کی مجبوری، معاشی اور سیاسی عدم استحکام کی مجبوری...... اور یہ سب مجبوریاں مل کر صورت حال کو روز بروز مزید مشکل بناتی چلی جاتی ہیں، جن سے نکلنے کے لئے تلخ نظریاتی فیصلوں کے علاوہ سب کوششیں بیکار ہوا کرتی ہیں۔

اسی نوعیت کا ایک نظریاتی حملہ ''جنسی اور تولیدی صحت اور حقوق'' (Sexual & Reproductive Health & Rights یا SRHR) کے نام پر امریکہ اور اقوامِ متحدہ اپنے ذیلی اداروں کے ذریعے ساری دنیا خصوصاً مسلم ممالک کے نظام تعلیم پر جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس ایجنڈے کو پیش کرتے ہوئے ایڈز اور جنسی تعلق سے پھیلنے والی بیماریوں کی روک تھام اور اگر زیادہ کریدا جائے تو ''برداشت'' (Tolerance) کو فروغ دینے کو جواز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

ہتھکنڈوں کے جواز کو زیر بحث لانے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ SRHR کیا ہے۔ جنسی اور تولیدی صحت اور حقوق میں چار چیزیں شامل ہیں: جنسی حق، جنسی صحت، تولیدی حق اور تولیدی صحت۔ اقوام متحدہ نے جنسی حقوق کی تعریف اپنے ایک کتابچے (Defining Sexual Health 2002) میں دی ہے جس کے سرِ ورق پر دو ہم جنس پرست لڑکوں کی تصویر ہے۔ اس کتابچے کے مطابق باہمی رضامندی

سے شادی ایک الگ جنسی حق ہے اور باہمی رضامندی سے بغیر شادی کے جنسی تعلق بھی جنسی حق ہے۔ ہم جنس پرستی بھی جنسی حق ہے۔ یہاں تک کہ والدین اور اولاد بھی باہمی رضامندی سے اگر ایک دوسرے سے جنسی تعلق قائم کرلیں تو یہ بھی جنسی حق ہے۔ نیز جنسی صحت کے تعارف (Sexual Orientation) کے نام پر ہم جنس پرستی سے آگاہی اور اسے 'برداشت' کے نام پر معاشرے میں جنسی تعلیم دینا بھی جنسی حق ہے۔

کوئی بھی ذی شعور آدمی یہ بات باآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ایسے حقوق کے نتیجے میں پاکستان بھی ایک فری سیکس سوسائٹی بن جائے گا۔ اس کام کے راستے میں ممکنہ رکاوٹوں کو حکومت پاکستان این جی اوز (NGO's) اور بین الاقوامی اداروں کے دباؤ میں آکر پہلے ہی حقوقِ نسواں بل اور خواتین کے خلاف تشدد بل پاس کر کے ختم کر چکی ہے۔ حقوقِ نسواں بل کے تحت قانونی گرفت کو کمزور کر دیا گیا اور تشدد بل کے نام پر اگر بچے اپنے والدین کے خلاف شکایت کریں تو والدین کو جرمانے اور سزا سنائی جائے گی۔ لہٰذا اس سارے ایجنڈے میں اب کوئی کمی اگر باقی رہ گئی ہے تو SRHR کی تعلیم کے ذریعے نوجوان نسل کو اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی پر اکسانا ہی باقی رہ گیا ہے۔

امریکی اور یورپی معاشروں میں جہاں ایک طرف اس تعلیم سے اپنے نظریات کا پرچار ہوتا ہے وہاں دوسری طرف سرمایہ دار کا بھی بھلا ہوتا ہے کیونکہ فری سیکس کے نتیجہ میں ناجائز بچے اور جنسی بیماریاں پھیلتی ہیں لہٰذا اس تعلیم میں جنسی اور تولیدی صحت کے نام پر مانعِ حمل طریقوں کا پرچار کیا جاتا ہے جس سے عورتوں کو حمل نہیں ٹھہرتا اور وہ ایک بال بچوں والی گھریلو زندگی کی بجائے معاشرے میں ''لیبر'' کے طور پر میسر ہوتی ہیں۔ پس مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا بھی لیبر (ورکر) کے طور پر میسر ہونا، لیبر کو آسان، وافر اور سستا کر دیتا ہے، لہٰذا سرمایہ دار کو ملازم سستے مل جاتے ہیں۔

پاکستان میں بہت سی این جی اوز اس ایجنڈے پر کام کر رہی ہیں اور ۲۰۰۹ء سے مسلسل مختلف نجی اسکولوں میں SRHR کے 'مضمون' کو مختلف کتب کے ذریعے پڑھانے کی کوششیں جاری ہیں۔ حال ہی میں ''حیات لائف لائن'' (Hayat Life Line) نامی این جی او نے اس ایجنڈے کو اور بھی گھناؤنا رنگ اس وقت دیا جب اس نے مختلف مکاتبِ فکر کے علما کو دھوکے سے اور اعزازیہ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ ان علما سے فقہی نوعیت کے چند سوال پوچھ کر کتابچے مرتب کیے گئے جن میں جنسی و تولیدی حقوق، کے متعلق سرے سے کچھ پوچھا ہی نہیں گیا مگر ان کتابچوں کو دکھا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ تمام مکاتبِ فکر کے علما اس ایجنڈے پر ان کے ساتھ متفق ہیں۔ یہ سازش ایک ریڈیو پروگرام میں بے نقاب ہوئی جو لاہور چیمبر آف کامرس کے ایف ایم ریڈیو کے ایک پروگرام میں اینکر پرسن ڈاکٹر غالب

عطاء کے ساتھ مولانا راغب نعیمی، حیات لائن لائف نامی این جی او کے سربراہ عمر آفتاب اور راقم الحروف کے درمیان ہوئی۔ یہ پروگرام مندرجہ ذیل لنک پر اب بھی سنا جا سکتا ہے۔

(http://radiomines.pk/audio/mulaqaat-with-dr-ghalib
-ata-dr-saleem-raghib-naeemi-umer-aftab-2/)

جہاں تک اس تعلیم کے لیے پیش کیے جانے والے اس جواز کا تعلق ہے کہ یہ پروگرام انسانی صحت کے لیے ضروری ہے تو امریکہ کو جنسی بیماریوں کے عدم پھیلاؤ کی کس قدر فکر ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ٹسکیجی تجربات (Tuskegee Experiments 1932-1972 by US Public Health Service) کے نام پر امریکہ نے بغیر بتائے سینکڑوں افریقی باشندوں میں جنسی تعلق سے پھیلنے والی بیماریوں کو دانستہ غلیظ سرنجوں کے ذریعے ان کے خون میں داخل کر دیا اور علاج موجود ہونے کے باوجود ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور کئی سال بعد کلنٹن نے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے معافی مانگ لینے کو اپنے گھناؤنے جرم کا مداوا سمجھ لیا۔

دوسری طرف جس عدم برداشت کو جواز بنا کر یہ ہم جنس پرستی کی تعلیم دے رہے ہیں تو اس ''برداشت'' کی اجازت قومِ لوط کے واقعات بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے تو نہیں دی۔

مختصر یہ کہ SRHR جیسا تعلیمی پروگرام جو مغرب کی الحادی تہذیب کے زیر اثر مسلم معاشرے میں مادر پدر جنسی آزادی اور فحاشی پھیلانے کے لیے لایا جا رہا ہے اس سے بچاؤ کے لئے اسلامی نظریاتی تعلیمی نظام کا حکومتی سطح پر نفاذ ہی واحد حل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا جدید سائنسی علوم کے ساتھ ساتھ شریعت کی تعلیم خصوصاً محرم اور غیر محرم کے احکام، پردے کے احکام، اسلام کے فحاشی اور بدکاری سے برأت اور کراہت کے احکام کا پرچار ضروری ہے نیز ایسی تعلیم ناگزیر ہے جو بچے کو حقیقی اسلامی شخصیت بنائے جس کا اسلام کا شعور صرف اخلاقیات اور عبادات کی حد تک ہی نہیں بلکہ سیاسی، معاشی، معاشرتی، عدالتی اور خارجہ پالیسیوں میں بھی اسلام کے نفاذ اور دنیا میں اسلامی نظریے کی بالادستی کو یقینی بنائے۔ اسی طرح تمام سرکاری اور نجی اسکولوں میں یکساں تعلیم اور سرکاری اسکولوں کی دانستہ زبوں حالی کو ختم کرنا بھی ضروری ہے مگر یہ سب ایک خودمختار اور اسلامی نظریاتی ریاست اور حکومت کے بغیر ممکن نہیں۔

آل پاکستان دینی مدارس

مقابلہ مضمون نویسی

موضوع: مذہبی فرقہ واریت: اسباب، نقصانات اور اصلاحی تجاویز

کی آخری تاریخ 15 جنوری 2014ء تک بڑھادی گئی ہے۔

تحریکِ اصلاحِ تعلیم (ٹرسٹ) ۱۳۶ نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور ۵۴۰۰۷

ای میل ermpak@hotmail.com

تزکیۂ نفس

ڈاکٹر محمد امین

# تصوف ۔ افراط وتفریط کی زد میں

## تصوف کی خرابیوں سے بدک کر تزکیۂ نفس سے تغافل جائز نہیں

ہم یہ بات ابتداء ہی میں واضح کر دیں کہ اس تحریر سے ہمارے پیش نظر تصوف کی بے جا مدافعت و حمایت نہیں بلکہ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب سے نا اہل صوفیاء نے اس کی علمبرداری کا کام سنبھالا ہے جو دین اور مقاصد دین سے نابلد ہیں اور جب سے ان متعصب نقادوں نے منصب امامت سنبھالا ہے جو دین کی حمایت کے جوش یا جدیدیت کی علمبرداری کے زعم میں گھن کے ساتھ گیہوں بھی پیسے جا رہے ہیں، لوگوں کی نظروں سے وہ حقیقت ہی مستور ہو گئی ہے جو تحریک تصوف کی ابتداء کرنے والوں کے پیش نظر تھی...... ہماری مراد تزکیۂ نفس سے ہے جو بلا ادنی تردد ہمارے دین کی بنیاد ہے، جو ہمیشہ سے انبیاء کا مقصد بعثت رہا ہے اور تعلیم کتاب وحکمت کی اصل غایت بھی وہی ہے۔

اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں کہ ادیان و افکار کی تاریخ میں ایسا ہوتا آیا ہے کہ حقائق بعض اوقات گرد کی تہہ میں دب جاتے ہیں جیسے بعض اوقات سورج کی روشنی بھی بادلوں کی اوٹ کی وجہ سے ہم تک نہیں پہنچتی یا کم پہنچتی ہے۔ اسی طرح حقائق بھی بعض اوقات کلی یا جزوی طور پر نگاہوں سے وقتی طور پر اوجھل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ تصوف کے بارے میں جاہل صوفیوں اور متعصب ناقدوں کی لڑائی کے نتیجے میں تزکیۂ نفس کی حقیقت اس طرح گم ہو گئی ہے جیسے تیتر اور بٹیر کی لڑائی میں تیتر کی چونچ اور بٹیر کی دم۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج تصوف کے رسوم ورواج میں بہت سی ایسی چیزیں داخل ہو گئی ہیں جو غیر اسلامی ہیں۔ آج ہمارے معاشرے میں تصوف کے بہت سے علمبردار، دین سے بے بہرہ اور علم دین سے کورے ہیں۔ وہ شریعت کا علم رکھتے ہیں اور نہ اس کے مقاصد کا۔ تصوف، معاف کیجیے گا، ان میں سے

بہت سوں کے لیے ایک منافع بخش کاروبار ہے جو انہوں نے وراثت میں پایا ہے۔ ان میں سے جو مخلص بھی ہیں ان کی خالص دین تک پہنچ نہیں ہوتی کیونکہ مآخذ دین تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ کچی پکی اور سنی سنائی باتوں کو ہی حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے۔ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تصوف کے چشمۂ صافی میں کچھ عرصہ گزرنے بعد ایسے عناصر کی ملاوٹ شروع ہو گئی تھی جو اسلامی مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بعد میں تصوف میں ایک پورا مکتبہ فکر ان صوفی دانشوروں کا پیدا ہو گیا جنہوں نے اسے ایک فلسفہ بنا دیا اور فلسفہ بھی ایسا جس میں اسلامی تعلیمات پر یونانی، ایرانی، ہندی اور عیسوی سرّیت (باطنی معارف و رسوم) کے اثرات موجود تھے۔

تصوف کی ان خرابیوں کو دیکھ کر کچھ علماء اور دینی سکالرز نے اسے بے دینی کی ایک شکل، دین سے انحراف، اسلام کے متوازی دین اور اسے بدعتوں کا مجموعہ اور جھوٹ کا پلندہ کہہ کر کلیتاً ردّ کر دیا۔

اہل علم جانتے ہیں کہ احادیث رسول ﷺ کی دینی اہمیت کے پیش نظر جلد ہی اہل حرص و ہوس نے جعلی احادیث گھڑ گھڑ کر پھیلانا شروع کر دی تھیں چنانچہ محدثین نے حق کو باطل سے ممیز کرنے کے لیے اسماء الرجال اور جرح و تعدیل کے علوم مدوّن کیے اور بہت سے علماء نے عمریں لگا کر ان وضعی اور منکر احادیث کی چھان پھٹک کرتے ہوئے صحیح احادیث کے مجموعے مرتب کیے اور یہ کام آج تک ہر عہد میں ہوتا آیا ہے۔ اس کے باوجود مسلمانوں میں ہزاروں وضعی اور منکر حدیثیں آج بھی مروج ہیں اور مسلمانوں کے بہت سے گروہ ایسے ہیں جن کا دینی کاروبار چلتا ہی ان وضعی اور منکر حدیثوں پر ہے...... لیکن اس سب کے باوجود کبھی کسی صاحب عقل و خرد نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ چونکہ صحیح احادیث کے ساتھ جعلی اور کمزور حدیثیں بھی شامل ہو گئی ہیں اس لیے سارے ذخیرۂ حدیث کو اُٹھا کر دریا برد کر دیا جائے۔

فقہ کی مثال لے لیجیے! ہمارے معاشرے میں اپنے اپنے فقہی مسلک کو دین بنا لیا گیا ہے۔ انہی فقہی نصوص کی روشنی میں قرآن کی تفسیر اور سنت کی تشریح کی جاتی ہے۔ انہی فقہی نصوص کے حوالے سے تقلید کو واجب کہا جاتا اور اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ان خرابیوں کی بنیاد پر کیا یہ مطالبہ جائز ہوگا کہ فقہ کے سارے ذخیرے کو اُٹھا کر پھینک دیا جائے؟

دینی مدارس کی مثال لے لیجیے! ہمارے معاشرے میں یہ مدارس شاندار خدمات انجام دے رہے ہیں، ہماری مسجدیں ان کے دم سے آباد ہیں اور معاشرے میں جتنا بھی دین ہے کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ اس کی ایک بڑی وجہ یہ دینی مدارس ہی ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان دینی مدارس کے نصاب میں آج بھی قرآن کے مقابلے میں حدیث اور حدیث کے مقابلے میں فقہ و لغت پر زیادہ ترکیز ہے۔ ساری تدریس مسلکی نقطہ نظر سے ہوتی ہے۔ یہاں صرف دینیاتی علوم پڑھائے جاتے

ہیں اور ان علوم سے اعتناء نہیں کیا جاتا جن کی مسلمانوں کو اس دنیا میں ضرورت ہے۔اس سے دین و دنیا کی غیر اسلامی تفریق ذہنوں میں راسخ ہورہی ہے۔کیا ان خرابیوں کی بناء پر یہ مطالبہ جائز ہوگا کہ دینی مدارس بند کردیئے جائیں؟

سوال یہ ہے کہ اگر وضعی حدیثوں کی بناء پر آپ سارے ذخیرۂ حدیث کو دریا برد نہیں کرتے ،فقہ کی خرابیوں کی بناء پر سارے فقہی ذخیرے کو ردّ نہیں کرتے ،دینی مدارس کی بعض کمزوریوں کو بنیاد بنا کر ان دینی مدارس کو بند کرنے کا مطالبہ نہیں کرتے تو یہ کون سی عقل و منطق کا تقاضا ہے کہ تصوف کی بعض خرابیوں کو بنیاد بنا کر تصوف کو کلیتاً ردّ کر دیا جائے؟ تصوف بھی حدیث وفقہ و دینی مدارس کی طرح ایک اسلامی ادارہ ہے۔پہلی صدی ہجری میں اس کا آغاز اس وقت ہوا جب دولت کی کثرت،تربیت کی کمی،حکومت کی بے توجہی،غیر مسلموں سے اختلاط وغیرہ کی بناء پر مسلمانوں میں اخلاقی کمزوریاں پیدا ہونا شروع ہوئیں تو حضرت حسن بصریؒ، ثابت بنانیؒ، مالک بن دینارؒ وغیرہ نے عوام کی اصلاح کے لیے کوششیں شروع کردیں۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک ایک ادارے کی صورت میں منظم ہوگئی،جس کا نام تصوف پڑ گیا۔ اپنی افادیت کی بناء پر یہ ادارہ اتنا مقبول ہوا کہ اس کے ہزاروں لاکھوں مراکز عالم اسلام میں پھیل گئے اور دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہ رہا جہاں مسلمان موجود ہوں اور وہاں خانقاہ اور زاویہ موجود نہ ہو۔مسلمان صدیوں دینی تعلیم کے لیے مدارس اور دینی تربیت کے لیے ان خانقاہوں اور زاویوں کی طرف رجوع کرتے رہے۔ اس ادارے نے کروڑوں مسلمانوں کی اصلاح کی، انہیں دین سے وابستہ رکھا۔ اسلام کی اشاعت صوفیوں نے چاردانگ عالم میں کی،منگولوں کو مسلمان کر کے اہل اسلام کو دوبارہ عظمت عطا کی، دینی مدارس قائم کیے، جہاد کیا، خدمت خلق کو شعار بنایا......غرض تصوف کی خدمات مسلّمہ اور ناقابل انکار ہیں اور بہت سی کمزوریوں اور خرابیوں کے باوجود آج بھی جاری ہیں لیکن بعض علماء اور سکالر نعرہ لگاتے ہیں کہ تصوف سرتاپا گمراہی ہے اور دریا برد کرنے کے قابل ہے۔ یہ ناانصافی ہے۔تصوف ایک اسلامی ادارہ ہے اس میں اگر کچھ خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں تو اس کی اصلاح کرنی چاہیے نہ کہ اسے کلیتاً ردّ کردینا چاہیے۔

تصوف کو کلیتہً ردّ کرنے والے یہ لوگ اگر تصوف کے مقابلے میں تزکیۂ نفس کے لیے کوئی متبادل ادارہ قائم کرتے اور خواہ اس کا نام بھی ترک کردیتے،تربیت کے نئے فکری مناہج سامنے لاتے اور نئی طرز کی تربیت گاہیں بناتے تو ہمیں خوشی ہوتی کہ چلیے انہوں نے ایک قدیم ادارے کو، جو اصلاح کا متقاضی تھا، نیا روپ دے دیا ہے لیکن انہوں نے تو سرے سے اس عظیم مقصد یعنی تزکیۂ نفس ہی کو نظر انداز کر دیا جس کے لیے یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا حالانکہ تزکیۂ نفس کوئی اختلافی یا فروعی مسئلہ نہیں یہ تو دین کی بنیاد ہے، یہ تو دین کا اساسی طریق کار اور نصب العین ہے۔قرآن صاف کہتا ہے کہ سارے پیغمبر اسی کام کے لیے

مبعوث کیے گئے تھے اور نبی آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی منصبی ذمہ داری بھی یہی تھی بلکہ خود تلاوت وتعلیم قرآن بھی ایک ذریعہ ہے تزکیۂ نفس کا۔ تو خود انصاف کیجیے کہ ایسے عظیم الشان مقصد سے صرفِ نظر کرنا کہاں کی عقلمندی ہے اور وہ بھی صرف تصوف کی بعض خرابیوں سے بدک کر۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تزکیۂ نفس کے لیے قرآن وسنت کافی ہیں لیکن انسانوں کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ محض علم (جان لینا) ان کو اکثر کفایت نہیں کرتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کتاب ہدایت بھیجنے کے ساتھ پیغمبر مبعوث فرماتے رہے جو نہ صرف عملی نمونہ پیش کرتے رہے بلکہ نفوس کی اصلاح کر کے انہیں عمل پر آمادہ کرتے اور انہیں اطاعت کا خوگر بناتے رہے۔ آج اگر کوئی شخص سلیم الفطرت ہو، اس کی تعلیم وتربیت ٹھیک ہوئی ہو اور وہ اسلامی تعلیمات پر عمل کر کے ان کے مطلوب نتائج سے کماحقہ متمتع ہو رہا ہو تو اسے یقیناً کسی خارجی مدد کی ضرورت نہیں لیکن اگر باوجود کوشش کے علم عمل میں نہ ڈھلے، آدمی معصیت کی دلدل میں پھنس جائے اور باوجود ذاتی کوشش کے اس سے نکل نہ سکے یا دینی تعلیمات پر عمل کے کماحقہ مثبت اثرات، باوجود اپنی پوری کوشش کے، اس پر مرتب نہ ہو رہے ہوں تو یقیناً اسے خارجی مدد کی ضرورت ہے اور کسی ایسے مسلمان کو یہ مدد لینے سے عار نہیں ہونا چاہیے جسے آخرت کی فکر ہو اور جو بہر قیمت اچھا مسلمان بننا چاہتا ہو۔ ایسا شخص گویا مریضِ نفس ہے جسے معالجے کی ضرورت ہے، اگر وہ معالج کے پاس نہیں جاتا تو ظاہر ہے اپنا نقصان کرتا ہے۔ تصوف میں مرشد اور مربی کا کردار یہی ہے کہ وہ آپ کے نفس کا علاج کر کے اسے دینِ حق کی تعلیمات پر عمل کے قابل بنا دیتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس بیماری کے علاج کے لیے جس تریاق سے کام لیا جاتا ہے وہ بھی سو فیصد منصوص ہے یعنی ذکرِ الٰہی، جس کی اہمیت وفضیلت سے قرآن وسنت بھرے پڑے ہیں۔

ہماری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ تصوف میں بہت سی خرابیاں موجود ہیں لیکن ان خرابیوں سے چڑ کر تصوف کے اس مقصد سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے جو ہمارے دین کی اساس ہے یعنی تزکیۂ نفس۔ اگر آپ دینی تعلیمات پر کماحقہ عمل کر رہے ہیں اور اس کے نتائج سے آپ مطمئن ہیں تو آپ خوش قسمت ہیں اور آپ کو کسی تصوف کی ضرورت نہیں لیکن اگر خدانخواستہ آپ کسی معصیت میں مبتلا ہیں اور باوجود کوشش کے اس سے بچ نہیں پا رہے یا آپ اپنی کوشش کے باوجود دینی تعلیمات پر کماحقہ عمل نہیں کر پا رہے یا ان کے مطلوب نتائج سے متمتع نہیں ہو پا رہے تو پھر آپ کو معالج (مرشد ومربی) کی ضرورت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تصوف میں خرابیاں پائی جاتی ہیں اور زمانہ قحط الرجال کا ہے لیکن اگر آپ مریض ہیں اور صحت کے متمنی ہیں تو ڈاکٹر کی تلاش تو آپ کی مجبوری ہے اور ہمارے معاشرے میں اچھے معالجوں کی بلاشبہ کمی ہے لیکن بہرحال وہ بالکل ہی ناپید نہیں ہو گئے۔ سچی تلاش شرط ہے۔

تزکیۂ نفس کے لیے قرآن وسنت کی تعلیمات، اس کا عملی منہاج، حقیقی مربی کی صفات اور تزکیۂ نفس سے متعلق دیگر موضوعات کے تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے ہمارا کتابچہ 'حقیقتِ تزکیۂ نفس' اور کتاب 'اسلام اور تزکیۂ نفس' یا اپنے استفسارات کے جواب کے لیے دفتر البرہان سے رابطہ کیجیے۔

اسلام اور فکر مغرب

ڈاکٹر محمد امین

# آئن سٹائن کی بے عقلی

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم مسلمانوں کے زوال کا بنیادی سبب داخلی ہے۔تاہم اس حقیقت کا انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ہم مسلمان آج جس عہد میں زندہ ہیں، اس میں ہمارے اور ہمارے دین کے لیے ایک بہت بڑا فتنہ اور چیلنج مغرب کی فکر و تہذیب ہے۔مغربی تہذیب جو آج کی دنیا کی غالب تہذیب ہے، اس کی فکری اساسات نہ صرف ملحدانہ اور غیر اسلامی ہیں بلکہ وہ اپنی پوری سیاسی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی، قانونی اور اسلحی قوت سے مسلم معاشرے پر حملہ آور ہے اور اسلامی بنیادوں پر اس کے استحکام، ترقی اور پیش رفت میں مانع ہے۔

اگر علمی اور فکری سطح پر مغربی چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کا سوچا جائے تو اس کے کئی مدارج ہو سکتے ہیں۔ایک تو یہ کہ اعلیٰ علمی سطح پر اہل مغرب کے معیار کی انگریزی (یا کسی دوسری بین الاقوامی زبان میں) لکھا جائے اور ان کے متداول اعلیٰ معیار کی Presentation کے ساتھ ان کے سامنے پیش کیا جائے تا کہ ان کی غلط فہمیاں اور مغالطے دور ہوں اور اسلامی نقطۂ نظر بے غبار انداز میں ان کے سامنے آ جائے۔ دوسرے یہ کہ مغربی فکر کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور دقیق علمی اسلوب میں مسلم معاشروں میں مروج زبانوں میں اسے پیش کیا جائے تا کہ مغربی فکر سے متاثر مسلم اہل علم اس کی گرفت سے نکل کر اپنے گھر کی مرغی کو دال سمجھنے کی ذہنی کیفیت سے باہر آسکیں۔

اس کی ایک تیسری سطح یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ایک عام مسلمان کو مغرب کے فکری غلبے سے بچانے کے لیے اپنی زبان میں ہلکے پھلکے اور عام فہم انداز میں لکھا جائے تا کہ وہ مغربی فکر کی خامیوں اور خرابیوں کو جان لے اور اس کے جال میں پھنسنے اور اس کے زہر کو شوگر کوٹڈ گولیوں کی صورت میں پیش کرنے کے اہل مغرب کے طریق واردات اور سازشوں سے بچ سکے۔

مغرب کے چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ان تینوں سطحوں پر کام کی ضرورت ہے اور ہر آدمی اپنی صلاحیت، ذوق اور وسائل کے مطابق یہ کام کرسکتا ہے۔

ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ ہم اس تیسری سطح پر کام کرنے کی معمولی استعداد رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم سے اس ضمن میں بن آتا ہے، اس میں لگے رہتے ہیں۔ چنانچہ البرہان میں یہ سلسلۂ مضامین شروع کیا جارہا ہے جس میں منضبط انداز میں فکر مغرب پر گہری علمی گفتگو کی بجائے اس کے مختلف پہلوؤں پر ہلکے پھلکے اور عام فہم انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے ۔ اللہ کرے کچھ لوگوں کے لیے یہ مفید ثابت ہو۔ جو ادارے اور اہل علم پہلی دو سطحوں پر فکر مغرب کے خلاف کام کرنا چاہتے ہیں یا کر رہے ہیں، ہم ان کے قدر دان اور مدح خوان ہیں اور اللہ سے ان کے لیے مزید توفیق کے دعا گو ہیں۔ مدیر

آئن سٹائن (۱۸۷۹۔۱۹۵۵ء) ہمارے عہد کا ایک انتہائی ذہین دانشور، ماہر طبیعیات اور نامور سائنس دان ہے۔ عام آدمی اسے اس لحاظ سے جانتے ہیں کہ اس نے امریکہ کے لیے ایٹم بم بنایا تھا جو اس نے جاپان پر گرا کر دوسری جنگ عظیم جیت لی تھی۔ وہ نسلاً یہودی تھا لیکن دراصل مذہب مخالف تھا۔ اس کا مشہور جملہ ہے 'Religion without Science is Blind' یعنی مذہب سائنس کے بغیر اندھا ہے[۱]۔ مذہب کا بنیادی اور مرکزی تصور اللہ کو ماننا ہے کیونکہ پیغمبروں کو اللہ ہی مبعوث فرماتا ہے، وہی ان پر مقدس کتابیں نازل کرتا ہے اور وہی انسان کو بتاتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے جس میں جزا و سزا کا فیصلہ ہوگا۔ لہٰذا اللہ کے بارے میں صحیح تصور اور اس کے بارے میں صحیح رویہ ہی مذہب کی جان ہے۔ مذہب کے بارے میں چونکہ آئن سٹائن کا تصور غلط ہے لہٰذا اللہ کے بارے میں بھی اس کی سوچ غلط ہے چنانچہ وہ کہتا ہے[۲]:

> The word 'God' is for me nothing more than the expression and product of human weaknesses, the Bible a collection of honorable but still primitive legends which are nevertheless pretty childish. No interpretation no matter how subtle can (for me) change this.

یعنی اللہ کا لفظ تصور میرے نزدیک انسانی کمزوریوں کا اظہار اور نتیجہ ہے۔ بائبل قابل احترام ہے لیکن یہ بہرحال پرانے وقتوں کے طفلانہ قصے کہانیاں کا مجموعہ ہی تو ہے۔ اور کوئی وضاحت، خواہ وہ کتنی ہی معنی خیز کیوں نہ ہو، میرے اس نقطۂ نظر کو بدل نہیں سکتی۔

اس سے ظاہر ہے کہ مذہب کے بارے میں آئن سٹائن کا یہ نقطۂ نظر کہ وہ سائنس کے بغیر انسانیت کی رہنمائی نہیں کرسکتا اور نہ انسان کی زندگی میں کوئی فیصلہ کن رہنما کردار ادا کرسکتا ہے، اس لیے غلط ہے

کہ اللہ کے بارے میں اس کا تصور غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اللہ کو مانتا ہی نہیں۔ اس کے نزدیک یہ انسانی کمزوریاں ہیں جن کی بناء پر انسان ایک زبردست اور پر ہیبت، قوت وہستی کا تصور کرتا ہے جو مشکل وقت میں اس کا ساتھ دے سکے، اس کی مدد اور سرپرستی کر سکے ورنہ درحقیقت کوئی خدا موجود ہے ہی نہیں۔

------------------------------------------------------

1) Albert Einstein, *Ideas and Opinions*, (Ed.Carl Seelig) Crown Trade Paperbacks, 1995, P.46.
2) Craig A. James, *The Religion Virus*: *Why You Believe in God*: *An Evolutionist Explains Religions Incredible Hold on Humanity*, O Books, 2010, p.105.

اس میں کوئی شک نہیں کہ بائبل ایک محرف کتاب ہے اور اس میں پرانے وقتوں کے الٹے سیدھے قصے کہانیوں کی کثرت ہے جو کسی ذہین آدمی کے لیے عذر اور جواز بن سکتی ہے کہ وہ اس کے ذریعے اللہ تک نہ پہنچ سکے (اور قرآن جو اللہ کی غیر محرف کتاب ہے اور اس میں اللہ اور مذہب کا صحیح تصور موثر دلائل کے ساتھ موجود ہے لیکن مغرب کا اُس وقت کا سیاسی اور علمی ماحول ایسا نہ تھا (نہ آج ایسا ہے) کہ آئن سٹائن قرآن کا معروضی مطالعہ کر سکتا اور مسلمانوں کی بھی یہ نالائقی ہے کہ ان میں آئن سٹائن کی علمی وفکری سطح کا کوئی شخص موجود نہ تھا جو اس کی توجہ قرآنی حقائق کی طرف مبذول کرا سکتا) لیکن آئن سٹائن جیسے ذہین شخص اور نکتہ رس دماغ کے لیے حقیقت کا ادراک نہ کر پانا ایک تعجب انگیز امر ہے کیونکہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ اللہ نے اپنا تصور ہر انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے (الاعراف ۷:۱۷۲) گویا یہ ہر انسان کی جینز (genes) میں بُنا ہوا (built in) موجود ہوتا ہے اور ہر انسان لاشعوری اور فطری طور پر اس کا احساس رکھتا ہے۔ الا یہ کہ ماحول، معاشرہ اور تعلیم اس کی فطرت مسخ کر دیں اور وہ غیر جانبدارانہ اور معروضی انداز میں سوچ سکنے کے قابل نہ رہے اور وہ اللہ کو نہ ماننے والی تعلیم، تہذیب اور معاشرت کے زیر اثر اللہ کو نہ ماننے کا رویہ اپنا لے۔ گویا انسان کا اللہ کو نہ ماننا غیر فطری اور غیر عقلی ہے۔

اللہ کو نہ ماننا اور اس کی پرستش واطاعت نہ کرنا ایک اور لحاظ سے بھی غیر فطری اور غیر عقلی ہے اور وہ یوں کہ ساری کائنات، چاند سورج سے لے کر جمادات، نباتات اور حیوانات تک، سب اللہ کی اطاعت اور پرستش کرتے ہیں یعنی اس فطرت کے مطابق عمل کرتے رہتے ہیں جس پر اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے اور وہ کام کرتے رہتے ہیں جس پر اللہ نے ان کو لگایا ہے۔ انسان اس کائنات سے ہم آہنگ زندگی اسی وقت گزار سکتا ہے جب وہ بھی اپنی اس فطرت کے مطابق زندگی گزارے جو اللہ کی عبادت واطاعت پر مبنی ہے
۔

اللہ کو ماننا اور اس سے محبت کرنا اور اس سے ڈرتے ہوئے زندگی گزارنا انسان کے لیے اتنا فطری اور عقلی ہے کہ دنیا میں آج بھی انسانوں کی بہت بڑی اکثریت کسی نہ کسی رنگ میں اللہ کو مانتی ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی تحقیق کے مطابق دنیا کے ۸۷.۵ فیصد انسان آج بھی کسی نہ کسی شکل میں اللہ کو مانتے ہیں (۱)۔

سوال یہ ہے کہ ان حقائق کی موجودگی میں مغرب کے ذہین اشخاص خصوصاً فلسفیوں، سائنسدانوں اور دانشوروں کا جن میں آئن سٹائن جیسا نابغہ روزگار انسان بھی شامل ہے، اللہ کے وجود کا انکار بے عقلی کی بات ہے یا نہیں؟ فرمایا پیغمبر اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کہ 'رأس الحکمة مخافة اللہ'(۲) (یعنی دانائی اور عقل مندی (Wisdom) کا سب سے اونچا مقام یہ ہے کہ انسان اللہ سے ڈرے۔ اور ظاہر ہے اللہ سے ڈر کر زندگی وہی گزار سکتا ہے جو اللہ کو مانتا ہو۔ گویا جو شخص اللہ کو نہیں مانتا اور اس سے ڈر کر زندگی نہیں گزارتا

---

(1 Encyclopaedia Bratannica, Book of the Year 1998.

۲) امام السیوطی، جامع الصغیر وزیادتہ، ج ۳، ص ۳۰۶۶

وہ عقل مندی اور دانائی سے محروم ہے۔ اس انتہائی بنیادی بات کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مقدس کے آغاز ہی میں کر دی کہ 'ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (البقرہ ۲:۲) یعنی اس کتاب میں گو ہدایت کی حتمی تعلیم موجود ہے لیکن اس سے عملاً ہدایت وہی حاصل کر پائے گا جو اللہ (کو مانے گا اور اس) سے ڈر کر زندگی گزارے گا۔ ☆

نیز قرآن حکیم میں بے شمار مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے وجود کے اثبات کے لیے انفس وآفاق سے دلائل دینے کے بعد یہ تبصرہ کیا ہے کہ کیا تم عقل نہیں رکھتے کہ ان نشانیوں پر غور کر کے ان کے خالق تک پہنچ سکو؟ ہم بطور نمونہ صرف ایک مثال دیتے ہیں:

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○ وَهُوَ الَّذِیْ ذَرَاَكُمْ فِی الْاَرْضِ وَاِ لَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ○ وَهُوَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (المومنون ۲۳: ۷۸-۸۰)

اس کا مطلب یہ ہے کہ انفس وآفاق کی یہ نشانیاں عقل مندوں کے لیے اللہ کے وجود پر دلالت کرتی ہیں اور اس کا یہ مطلب بھی واضح ہے کہ انفس وآفاق کے ان دلائل اور نشانیوں کے باوجود جو اللہ کو نہیں مانتا اور اس کی پرستش و اطاعت کی زندگی نہیں گزارتا وہ عقل و دانش سے محروم ہے بلکہ قرآن کے الفاظ میں ایسے لوگ ''بہرے، گونگے اور اندھے ہیں' (البقرہ ۲:۱۸) 'اور ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں، یہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے' (الاعراف ۷:۱۷۹) اور ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ

عہد الست اور انفس وآفاق کی نشانیوں سے سبق نہیں سیکھتے اور شہوات نفس اور دنیا کی محبت اور رنگینیوں میں غرق خدا اور آخرت کے انکار کی روشن پر گامزن ہیں وہ گویا (دنیا کے) کتے ہیں (الاعراف ۷:۱۷۶)۔

تاہم یہ سوال پھر بھی ذہن میں اٹکتا ہے کہ بعض لوگ جن کی ذہانت (اور بعض اوقات عبقریت) دنیاوی لحاظ سے مسلمہ ہوتی ہے وہ کیونکر ذات باری اور حق کا ادراک نہیں کر پاتے؟ اس کے کئی سبب سمجھ میں آتے ہیں۔ ایک تو وہ جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں کہ غلط تعلیم و تربیت اور غلط ماحول، جس کی وجہ سے آدمی متوازن، معروضی اور غیر جانبداری سے سوچنے کے قابل نہیں رہتا بلکہ اس کا ذہن یک رخا اور متعصب ہو جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی دنیا اور اس کی آسائشوں، سہولتوں اور رنگینیوں

---

☆ واضح رہے کہ قرآن میں لفظ 'متقین' استعمال ہوا ہے اور تقویٰ کا ترجمہ اردو میں ہم عموماً 'اللہ سے ڈرنے'' کا کرتے ہیں لیکن اہل علم ولغت جانتے ہیں کہ تقویٰ میں خشیت کے ساتھ محبت بھی شامل ہوتی ہے اور یہ دونوں صفات لفظ الہ/اللہ کے مفہوم میں بھی شامل ہوتی ہیں۔

میں غرق رہتا اور دنیوی کامیابیوں اور خوشحالی میں مگن رہتا ہے اور اللہ وآخرت سے غافل ہو جاتا ہے۔

ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ بعض اوقات آدمی کسی خاص شعبے کی طرف زیادہ متوجہ رہتا ہے، ہر وقت اس کے بارے میں سوچتا اور محنت کرتا ہے اور اس میں آگے نکل جاتا ہے اور اس میں کمال (Excellence) اور عظمت حاصل کر لیتا ہے لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں میں وہ ایک عام آدمی کی طرح ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال کے ملفوظات میں ہے کہ ایک آدمی نے ان سے پوچھا کہ فلاں شخص بہت ذہین اور لائق ہے اور نامور انجینئر ہے لیکن اس نے قادیانیت قبول کر لی ہے۔ علامہ نے فرمایا کہ یہ قادیانیت کے سچا ہونے کی دلیل نہیں بلکہ وہ آدمی زیادہ توجہ اور محنت کی وجہ سے انجینئرنگ کے شعبے میں آگے نکل گیا ہے لیکن زندگی کے دوسرے شعبوں میں ایسے آدمی کی عقل اور ذہانت عام آدمی جتنی ہی ہوتی ہے کیونکہ اس نے ان امور کا کوئی خصوصی مطالعہ نہیں کیا ہوتا، نہ اس کی بابت زیادہ سوچ بچار کی ہوتی ہے اور نہ اس طرف زیادہ توجہ دی ہوتی ہے۔ ہمیں علامہ اقبال کی اس بات کے صحیح ہونے کا اس وقت احساس ہوا جب کئی سال پہلے ہم نے ایک ٹی وی پروگرام دیکھا جس میں آٹھ دس نوبل انعام پانے والے سائنسدان اور ادیب موجود تھے۔ میزبان نے ان سے مذہب کے بارے میں جو سوالات پوچھے اور انہوں نے ان کے جو جوابات دیے وہ اتنے بچگانہ اور عامیانہ تھے کہ ہم سن کر حیران ہوئے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ زندگی کے کسی خاص شعبے میں اپنی ذہانت سے آگے نکل جانے والے لوگ ضروری نہیں کہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی اتنے ہی ذہین ہوں اور ان میں پختہ اور صحیح رائے قائم کرنے کے اہل ہوں۔ لہٰذا آئن سٹائن، برٹرینڈ رسل اور بعض دوسرے مغربی دانشوروں اور سائنسدانوں نے فزکس، فلسفے یا کسی دوسرے شعبۂ علم میں اگر کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں تو ضروری نہیں کہ مذہب کے بارے میں بھی ان کی رائے اتنی ہی پختہ، سنجیدہ اور دانشمندانہ ہو۔

آخری بات یہ کہ ہم مسلمان جو خود کو حق پر کہتے اور حق کے علمبردار سمجھتے ہیں، ہم بھی اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں کیونکہ ہم نام تو اسلام کا لیتے ہیں لیکن اس کی تعلیمات پر عمل نہیں کرتے۔ ہماری یہ منافقت نہ صرف دنیا میں ہماری ذلت و نکبت کا سبب ہے بلکہ اس نے اشاعت اسلام میں بھی رکاوٹ ڈالی ہے۔ ہمارے اس غیر ذمہ دارانہ اور منافقانہ طرزِ عمل کی وجہ سے غیر مسلم اسلام کو اور اس کی صحیح قدر و قیمت کو سمجھ نہیں پاتے اور وہ یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہیں کہ جس مذہب (اسلام) پر عمل کرنے والے ایسے جاہل، پسماندہ اور بے کردار لوگ ہوں وہ کیسے صحیح اور سچا مذہب ہوسکتا ہے؟ لہٰذا ہماری بے عملی اور منافقت نے آج دنیا میں اسلام کے حق میں وہ ماحول پیدا ہی نہیں ہونے دیا جس سے لوگ اس کی عظمت اور اہمیت کی طرف متوجہ ہوسکتے۔ مغرب میں آج کل جو لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں وہ عموماً اپنی روحانی پیاس بجھانے اور روحانی خلا کو پر کرنے کے لیے حقیقت کی تلاش و جستجو میں ایک لمبا سفر طے کرنے کے بعد ہی اسلام کے چشمۂ صافی تک پہنچ پاتے ہیں جب کہ ہم مسلمانوں کا طرزِ عمل اور ہمارا اخلاقی رویہ ان کے لیے مایوسی کا سبب بنتا ہے اور ان کے آگے بڑھ کر قبول اسلام میں ممد و معاون نہیں ہوتا، فاعتروا یا اولی الابصار۔

اسلام اور فکر مغرب

سید خالد جامعی ☆

# مولانا وحید الدین خاں - ایک فکری جائزہ (۲)

کیا جدید سائنس و ٹکنالوجی اور وحی الٰہی یکساں درجے کے علم ہیں؟ مولانا وحید الدین خان کی رائے ہے کہ "علم کے دو ذریعے ہیں ایک مبنی بر وحی علم جو علم نقلی کہلاتا ہے اور دوسرا عقل انسانی پر مبنی سائنسی دور کا جدید علم جسے عقلی علم کہتے ہیں۔ قرآن حکیم میں دونوں قسم کے علوم کو مستند علم [Authentic Knowledge] تسلیم کیا گیا ہے"۔ خاں صاحب کا یہ استدلال مذہبی منہاج، فلسفیانہ منہاج اور جدید سائنس و ٹکنالوجی کے منہاج میں ناقابل قبول ہے۔ وحی الٰہی لوح محفوظ سے آنے والا علم ہے، یہ کلام ربی ہے جو اذن ربی سے قلب پیغمبر پر نازل کیا گیا اس میں کسی کمی بیشی کا کوئی امکان نہیں۔ یہ حتمی، مطلق، قطعی، ناقابل تغیر، ترمیم، تبدیلی و تنسیخ علم ہے کیوں کہ یہ خالق کائنات نے نازل کیا ہے۔ عقلی علم ہمیشہ متغیر رہتا ہے کیونکہ وہ عقل انسانی سے صادر ہوتا ہے جو مخلوق ہے لہٰذا مخلوق نہ خالق کے برابر ہوسکتی ہے نہ اس کا علم خالق کے علم کے مساوی ہوسکتا ہے۔ سائنسی علم فلسفۂ سائنس اور جدید سائنس کے منہاج میں اس علم کو کہتے ہیں جو نو خصوصیات کا حامل ہو۔

سائنسی علم وہ ہے (۱) جس پر شک [Doubt] کیا جاسکے (۲) جس کی تردید [Falsify] کی جاسکے (۳) جس کو اسی طرح حاصل کیا جاسکے جس طرح حاصل کرنے والے نے دعویٰ کیا ہو (۴) جس کو

حواس خمسہ اور تجربات کے ذریعے جانا جاسکے (۵) جس کو ریاضی کی زبان میں بیان کیا جاسکے (۶) جس میں ہر لمحے تبدیلی، تغیر، ارتقاء کا امکان تسلیم کیا جائے، (۷) جسے صرف ممکنہ سچ [Probable Truth] سمجھا جائے نہ کہ مطلق سچ [Absolute Truth]۔ (۸) سائنس اشیاء کا علم [Knowledge of things] دیتی ہے۔ صداقتوں کا علم [Knowledge of Truth] نہیں دیتی وہ شے کے ظاہر کا علم دیتی ہے مگر شے کی حقیقت باطن کا علم نہیں دیتی حقیقت اشیاء کا ادراک سائنس کے لیے محال ہے۔ (۹) سائنس کل [Total] کا علم نہیں دیتی، صرف جزو [Part] کے ادنیٰ سے جزو کا جزوی [Partial] علم دیتی ہے ۔ وہ علم جو ان نو شرائط پر پورا اترتا ہے وہ فی الواقع سائنسی علم کہلانے کا مستحق ہے کیا وحی الٰہی اور سنتِ محبوبِ الٰہی ان نو شرائط پر پورا اترتی ہے۔ ظاہر ہے وحی اور سنت ان شرائط پر پورا نہیں اترتی لہٰذا یہ غیر سائنسی علم ہے تو سائنس اور وحی برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟

---

☆ ناظم، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی

وحی الٰہی ان نو اوصاف سے خالی ہے لہٰذا وحی کا علم عقلی علم یعنی جدید سائنس کے علم کے مساوی نہیں ہوسکتا۔ سائنس پر ایمان بالغیب کا رویہ عموماً اسلامی ممالک کے مفکرین میں عام ہے جس کا سبب غلامی کی وہ طویل رات ہے جس نے امت مسلمہ کو فکر صحیح سے محروم کر دیا۔ اصل غلامی جسم کی غلامی نہیں ذہن کی غلامی ہوتی ہے۔ آزادی کی صبح اسلامی ممالک کے لیے جسمانی، جغرافیائی، علاقائی، سیاسی، آزادی کا پیغام تو لے کر آئی لیکن فکر کی آزادی کا پیغام نہیں لاسکی۔ فاتح قوم جب اسلامی ممالک سے رخصت ہوئی تو مغلوب اور غلام قوموں کے فکر ونظر کے پیمانے بدل چکے تھے لہٰذا ان غلام قوموں کے مفکرین کے قلوب مغرب کی مسلط کردہ علمیت نے فتح کر لیے تھے۔ امتوں اور قوموں کی فتح وشکست کا اصل میدان علمی میدان ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم یا امت مدمقابل قوم یا امت سے فکری علمی میدان میں شکست کھا جائے لیکن عسکری طور پر فاتح رہے تب بھی یہ فتح بالآخر شکست میں بدل جائے گی۔ عسکری فتح وشکست عارضی ہوتی ہے لیکن فکری علمی میدان میں شکست دائمی ہوتی ہے۔ اسی لیے تاریخ کے ہر دور میں جب بھی پیغمبر تشریف لائے۔ انھوں نے اپنی مدمقابل تہذیب کی علمیت کو چیلنج کیا اور اسے شکست دی۔ مدمقابل امت کی صرف مابعد الطبیعیات کو ہی رد نہیں کیا اس کی طبیعیات کو بھی رد کر دیا۔ عاد، ثمود اور فراعنہ مصر کی تہذیب اور سائنس کو قبول نہیں کیا گیا کہ اسی نے عاد، ثمود اور فرعون کو خدا کے انکار پر اکسایا تھا۔ انبیاء نے ان قوموں کی سائنس وٹکنالوجی کو نہ محفوظ رکھا نہ اس میں اضافہ کیا نہ اس کی جستجو کی۔ مغرب کا کمال یہ ہے کہ اس نے ہمیں غلام بنانے کے بعد آزاد تو کیا لیکن اپنی علمیت، اپنے علوم وفنون، اپنی تہذیب اور معاشرت

سب کا غلام بنالیا۔کسی قوم پر اللہ کا بدترین عذاب یہ ہے کہ وہ قوم فکر صحیح سے محروم ہوجائے۔امت مسلمہ عہد حاضر میں اسی عذاب میں مبتلا ہے۔اس امت کے مفکرین کا دوسرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ لا ادری کہنا بھول چکے ہیں لہٰذا علم کے نام پر جہالت عام ہورہی ہے یہ وہ عذاب ہے جو ہم نے خود تخلیق کیا ہے۔ اکیسویں صدی میں جدید سائنس کو اعلیٰ ترین علم تسلیم کرنے کے دعوے اسی غلامی کا نتیجہ ہیں مغرب میں جدید سائنس کی عظمت و برتری کو گزشتہ پچاس سالوں سے تسلیم نہیں کیا جارہا پوسٹ ماڈرن ازم نے آفاقیت کے تمام دعووں کی نفی کردی ہے اس مکتب فکر کے خیال میں الحق، الخیر جیسے Mega narratives سرے سے وجود ہی نہیں رکھتے۔کوئی دعویٰ کوئی الحق آفاقی نہیں ہے سب اپنے زماں و مکاں، تاریخ وتہذیب وثقافت کے اسیر ہیں لہٰذا عقلیت، جمہوریت انسانی حقوق اور مغرب کی علمیت کے آفاقی دعوے محض دعوے ہیں جن کی کوئی علمی عقلی بنیاد نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمیں جمہوریت، انسانی حقوق اور سائنس وغیرہ جمالیاتی طور پر اچھے لگتے ہیں کیوں کہ یہ ہمارا تاریخی تجربہ ہے لیکن جمالیاتی پسند و ناپسند کی بنیاد پر آفاقیت کے دعوے نہیں کیے جاسکتے۔ پوسٹ ماڈرن فلسفی ماڈرن ازم کے تمام دعووں تمام اور علوم تمام اداروں کی آفاقیت کی نفی کررہے ہیں لیکن مولانا وحید الدین خاں صاحب جو پوسٹ ماڈرنسٹ مفکرین کے علمی وفلسفیانہ کاموں سے ناواقف ہیں اس صدی میں ماڈرن ازم کے ان دعووں کی بازگشت ہمیں سنارہے ہیں جو اٹھارہویں صدی میں تخلیق ہوئے اور اکیسویں صدی میں پس جدیدیت کی اندرونی تنقید[Internal Critique of Post Moderninsm] کے نتیجے میں رد ہوچکے ہیں۔جدیدیت کی آفاقیت اور عالمگیر صداقت باطل ثابت ہوچکی ہے۔جدیدیت اپنی تاریخ میں محصور، اپنے جغرافیہ کی اسیر اور اپنے تجربات کی قیدی ہے وہ آفاقی علمیت کا دعویٰ کیسے کرسکتی ہے؟ نہ اس کی سائنس آفاقی ہے نہ اس کی اخلاقیات اور نہ تہذیب واقدار مگر عالم اسلام کے جدیدیت پسند اور مخلص مسلم مفکرین ابھی تک جدیدیت کے مسترد کردہ آفاقی دعووں کو اسلام سے ثابت کررہے ہیں۔ ہماری نظر میں سائنس کو وحی کا درجہ دینا یا وحی سے بہتر قرار دینا یا وحی کے برابر سمجھنا یا وحی کے فہم کو سائنس پر منحصر کرنا۔مغربیت، جدیدیت سے مرعوبیت کے سوا کچھ نہیں۔دین کا تقاضا ومطالبہ یہ ہے کہ وحی کو ہر عقلی علم سے برتر، بہتر اور افضل سمجھا جائے اور کسی علم کو اس کے مساوی تسلیم نہ کیا جائے۔

علامہ جوہری طنطاوی نے تفسیر جواہر القرآن کے ذریعے تاریخ اسلامی میں پہلی مرتبہ قرآن کی سائنسی تفسیر کرنے کی کوشش کی۔ مذکورہ تفسیر صرف دس سال کے عرصے میں سائنسی ترقی کے باعث اس قابل نہ رہی کہ اسے علمی حلقوں میں پیش کیا جاسکے۔ جدید سائنسی نظریات کی دنیا میں اتنی تیزی سے تغیرات آرہے تھے کہ قرآن ان کا ساتھ دینے سے قاصر تھا لیکن سائنسی تفسیر کی لہر نے عالم اسلام کے

موقر حلقوں کا احاطہ کر لیا۔اس موج بے کراں کی ایک صورت ترکی کے بدیع الزماں سعید نورسی کی تحریروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔قرآن کی ہر آیت سے وہ کوئی نہ کوئی سائنسی ایجاد نظریہ،اصول نکال کر دکھا دیتے ہیں۔ان کے علمی جانشین اب فتح اللہ گولن ہیں۔گولن صاحب کی تحریروں میں علامہ طنطاوی اور نورسی صاحب کے افکار کی بازگشت سنی جاسکتی ہے۔سیکولر اسلامسٹ گولن صاحب اپنے اسکول کے ذریعے اسلامک سیکولرازم کو بھی عام کر رہے ہیں اور وحید الدین خان صاحب کی طرح سائنس زدگی اور غرب زدگی کو بھی اسلامی اصطلاحات میں بیان کر کے امت کے لیے قابل قبول بنا رہے ہیں۔مغرب اس بارے میں اور گولن صاحب کے بارے میں کیا سوچتا ہے اس کی تفصیلات جاننے کے لیے آپ Rand کارپوریشن کی رپورٹ Building Moderat Muslim Networks کا ص ۴۷ اور ص ۸۹ کا مطالعہ کیجیے اور Lee Marsden کی مرتبہ کتاب *Companion to Religion & Conflict* کو پڑھ لیجیے۔

عالم اسلام میں قرآن کی سائنسی تفسیر کا رویہ اب ایک مکتب فکر بن گیا ہے جس کی نمائندگی بے شمار علماء و مفکرین کر رہے ہیں۔اس سلسلے میں ایک مفصل تحریر زیر تسوید ہے جس میں سائنس زدگی کے سو سال کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔مولانا وحید الدین خان بھی اس مکتب کے صف اول کے لوگوں میں شامل ہیں اس مکتب کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ

شاہ ولی اللہؒ نے اپنی کتاب الفوز الکبیر میں پانچ علوم قرآن بیان کیے ہیں۔ان میں سے ایک تذکیر بالا یہ اللہ ہے۔

قرآن حکیم کی وہ آیات جو تذکیر ب آلا یہ اللہ سے تعلق رکھتی ہیں ان کی تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ ہم جدید سائنسی علوم [Modern Natural Sciences] کے بارے میں علم رکھیں۔یہ قرآن کے امدادی و معاون علوم میں سے ہے۔اس کے بغیر ہم قرآن حکیم کے اس خاص حصے کی تفہیم سے قاصر رہیں گے۔اور وہ آیات ہمارے لیے متشابہات کا درجہ رکھیں گی۔قرآن حکیم کا یہ پہلو ایسا ہے کہ نیچرل سائنسز کے بارے میں جتنی تحقیقات سامنے آئیں گی، اسی قدر قرآن حکیم کے اس پہلو کی تفسیر ہو سکے گی۔قرآن کریم کے بارے میں نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے''لا تنقضی عجائبہ'' کہ قرآن کے عجائبات کبھی ختم نہ ہو سکیں گے۔علوم کا یہ باب حواس، مشاہدہ اور تجربہ سے تعلق رکھتا ہے اور یہ علم کوئی اعتقادی یا شرعی نہیں ہے، جس میں ہم سلف سے اختلاف نہیں کر سکتے۔ایک مفکر لقد خلقنا الانسان من سلالۃ من طین کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’ایسے معاملات میں قدیم مفسرین سے اختلاف کرنا قابل اعتراض نہیں ہے۔ظاہر ہے کہ علم الاشیاء کے متعلق انسان کی واقفیت جتنی بڑھے گی اس کے بیانات کا مطلب پہلے سے زیادہ صحیح طریقے سے سمجھ میں آتا چلا جائے گا۔ یہ کوئی احکام شرعیہ یا امور اعتقادیہ نہیں ہیں جن میں سلف کا فہم زیادہ معتبر ہو‘‘۔ان نیچرل سائنسز اور دیگر علوم کے مطالعے سے کائنات کے راز کھلیں گے جس کا نتیجہ قرآن کی حقانیت پر منتج ہوگا۔ ارشاد ہے: سنریھم آیتنا فی الآفاق و فی انفسھم حتی یتبین لھم انه الحق (حم السجدۃ:۵۳) یعنی ہم عنقریب انہیں انفس وآفاق میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے (یعنی ایسے علمی حقائق ان پر منکشف کریں گے کہ وہ برحق ہے۔[انه] میں ضمیرہ کا مرجع مفسرین کے نزدیک قرآن حکیم بھی ذکر کیا گیا ہے۔آیت میں نشانیوں سے مراد یہی نیچرل سائنسز ہیں۔سرسید نے نہایت اچھی بات کہی ہے کہ قرآن حکیم اللہ کا کلام word of God ہے اور کائنات اللہ تعالیٰ کا فعل work of God ہے۔مختلف مفسرین نے اپنے اپنے دور کے اعتبار سے قرآن حکیم کی تفسیر بیان کر کے اس دور کے فتنوں کا ازالہ کیا اور اب نیا دور ہے جس میں تجرباتی علوم کو بہت اہمیت حاصل ہے۔اس میں ضرورت ہے کہ جدید معلومات اور تحقیقات کی روشنی میں اعجاز قرآن اور قرآن کی صداقت کو عیاں اور آشکار کیا جائے۔ یہ کام وہی کر سکتے ہیں جو نیچرل سائنسز پر دسترس رکھتے ہوں۔اگر ایسے اہل علم مہیا نہیں ہیں تو قرآن حکیم کی تفہیم کے اس حصے میں خلا باقی رہے گا۔قرآن حکیم نے اپنے اندر تدبر کرنے کی دعوت دی اور نیچرل سائنسز سے متعلق آیات دراصل تدبر کا سب سے زیادہ حق رکھتی ہیں۔بارش سے متعلق سورۂ فاطر کی آیت دیکھیں کہ اس میں کائناتی علم کے کئی پہلو بیان ہوئے ہیں۔قرآن حکیم کے اس مقام پر کئی علوم کا تذکرہ ہے۔اب آپ خود ہی سوچیں کہ ایک شخص جو صرف عربی زبان وادب کا ماہر ہو، فقہ پر بھی گہری بصیرت رکھتا ہو، وہ ان آیات کو صرف اس حد تک ہی دیکھے گا کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی مختلف نشانیوں کا ذکر ہے اور ہمیں اس کی نعمتوں کا اعتراف کرنا چاہیے۔نیچرل سائنسز میں سے کسی ایک میں پی ایچ ڈی یا پوسٹ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا حاصل شخص جسے عربی زبان میں بھی مہارت حاصل ہو تو ایسا شخص اس مقام کو کسی اور نگاہ سے دیکھے گا۔جدید مفسر کا فرض ہے کہ وہ کتاب الٰہی کی آج کی یعنی جدید دور کی زبان میں ترجمانی کریں۔ سورۃ فاطر کی دو آیات جو اوپر ذکر کی گئی ہیں ان کے بعد والی آیت کے آخر میں اللہ تعالی نے فرمایا انما یخشی اللّٰہ من عبادہ العلماء بے شک اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں اس جزء کے سیاق وسباق کو دیکھیں تو اس سے پہلے طبیعیاتی اور تکوینی علوم کا تذکرہ ہے، علوم شرعیہ کا بیان نہیں ہے جس سے یہ چیز ظاہر ہو رہی ہے کہ نیچرل سائنسز کے ماہرین کو العلماء کہا گیا ہے اور ان حقیقی علماء کا وصف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔معلوم ہوا کہ جو لوگ نیچرل سائنسز کا علم رکھتے ہیں وہ

قرآن حکیم کے اس حصے کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں جو نیچرل سائنسز سے متعلق ہے۔اوران علوم سے محروم شخص ان آیات کو پڑھتے ہوئے کوئی گہرا اثر لیے بغیر آگے گزر جائے گا'' اس عبارت سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ غیر یقینی غیر قطعی سائنس جو مغرب میں عہد حاضر کا مذہب بن چکی ہے۔اور کانٹ کے فلسفے کے بعد کہ مابعد الطبیعیات کا علم انسان کے ادراک سے ماورا ہے،سائنس ہی اصل العلوم تسلیم کر لی گئی ہے اور ہر علم کو علم اسی وقت تسلیم کیا جاتا ہے۔جب وہ سائنس کے معیار پر پورا اترے۔اب یہی سائنس اسلام پسند مفکرین کے لیے بھی وحی الٰہی کا درجہ رکھتی ہے کیونکہ خان صاحب لکھ چکے ہیں کہ علم نقلی وحی اور علم عقلی جدید سائنس یکساں سطح کے علم ہیں آیئے۔ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جدید سائنس،نیچرل سائنس وغیرہ کے بارے میں فلسفہ سائنس کے مفکر و فلسفی John Dupre اپنی کتاب Human Nature & Limits of Science میں کیا کہتے ہیں؟ آکسفورڈ پریس سے شائع ہونے والی اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ کسی بھی سوال کا سب سے بہترین جواب صرف سائنس ہی دے سکتی ہے یہ رویہ عہد حاضر میں عام ہے اسے سائنسٹزم [Scientism] کہا جاتا ہے اس رویے کو وہ درست رویہ نہیں سمجھتا مگر ہمارے جدیدیت پسند مسلم مفکرین خصوصاً ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی ، یوسف قرضاوی ،وحید الدین خان صاحب......وغیرہ اپنے تمام تر احترام کے باوجود اسی ازم کا شکار ہیں۔

This programme illustrates the hold on our culture of what I call scientism, an exaggerated and often distorted conception of what science can be expected to do or explain for us. One aspect of scientism is the idea that any question that can be answered at all can best be answered by science. This in turn, is very often combined with a quite narrow conception of what it is for an answer, or a method of investigation, to be scientific. Specifically, it is supposed that canonical science must work by disclosing the physical or chemical mechanisms that generate phenomena.[John dupre, *Human Nature and the Limits of Science*, p. 1,2]

عہد حاضر کا مذہب سائنس ہے۔جس طرح کبھی ہم انسان اور کائنات کی حقیقت جاننے کے لیے پادریوں سے رجوع کرتے تھے اب تجربہ گاہوں میں سفید لباس میں ملبوس سائنس دانوں کی طرف رجوع کرتے ہیں یعنی پادریوں کی جگہ سائنس دانوں نے انجیل کی جگہ سائنس نے اور کلیسا کی جگہ یونیورسٹی اور سائنسی تجربہ گاہوں نے لے لی ہے۔ریاست اور حکومت تمام پیسہ سائنسی علوم پر خرچ کر رہی ہے۔فیرار

بینڈ نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے اور ریاست سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ سائنس کی مالی سرپرستی ترک کردے۔ فیرار بینڈ کے بارے میں تفصیلات کے لیے اردو قارئین ہمارے شاگرد رشید جناب ظفر اقبال کی کتاب ''اسلام اور سائنس جدید تناظر'' میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ Dupre لکھتا ہے کہ

Science, it is often said, is the religion of our era. Where once we expected priests to give us insight into the nature of the cosmos and of human existence, now we look rather to men, and sometimes women, in white lab coats. Where once public expenditure in the service of deeper truth might have taken the form of mighty catherdrals, today it will be found in cyclotrons and gene sequencers. The paralles between religion in the medieval period & Science are brilliently explored by Feyerabend. (1978) While it is no part of the thesis of this book that we shoud return to this earlier age of theocratic epistemology, I shall argue that science, as it has traditionally been conceived, has serious limitations in its ability to answer some of the most profund questiions we are given to ask and more specifically, to answer questions about the nature and causes of human behaviour. [John dupre, *Human Nature and the Limits of Science,* p. 4]

طبیعیات کو علوم سائنس میں اعلیٰ ترین درجہ حاصل ہے یہ سائنس کی ملکہ ہے اور سائنس کی ہر شاخ اس کے تنے سے پھوٹتی ہے لہٰذا سائنس اور فلسفے کی دنیا میں ڈیڑھ سو سال تک یہ عقیدہ قائم رہا کہ سچائی کا حصول صرف طبیعیات کے ذریعے ممکن ہے۔طبیعیات کے بارے میں یہ عقیدہ فلسفہ تحویلیت philosphy of reductionism کہلاتا ہے۔یعنی فلسفہ سائنس کا یہ عقیدہ کہ سارے علوم کی طریقیات کسی ایک سائنس کی طریقیات میں تحویل پذیر ہیں یا ایک قسم کے اصول یا ایک سائنس کے اصول وتصورات سارے مظاہر کی توضیحی اساس بن سکتے ہیں، یہ بالکل اسی طرح کا عقیدہ ہے جس طرح ما بعد الطبیعیات میں یہ عقیدہ کہ سارے مظاہر وحقائق ایک ہستی، ایک جوہر یا عملیہ میں تحویل پذیر ہیں جو مطلق وجوبی اور حقیقی ہو۔

لیکن جدید عصری تحقیقات نے اس عقیدے، ایمان، یقین، واہمے، مفروضے کو غلط ثابت کر دیا۔ Dupre لکھتا ہے:

These philosophers held that the only ultimate truth about the world was the truth to be gained from physics; and that this was in a certain sense the complete truth. Against the prima facie appearance that the vast majority of knowledge concerned much larger, more complex things than were the preserve of physicists, they argued that scientific knowledge about large, complex things could be shown to be derivable from knowledge about large complex things could be shown to be derivable from knowledge about the simple things described by physicists. This was classical physicalist reductionism.

More recently it has been increasingly widely recognized that in practice no such reductive programme was remotely feasible. There was no way;, for instance, to derive biological facts about organisms exhaustively from facts about molecules, and it has become more and more clear that there is little chance even of deriving much of chemistry from physics.

I won't discuss the details of these problems here, but rather would like to look at some of the responses they have provoked. The difficulty, simply put, was that while physics was still held in principle to embody the complete truth about the world, most of that truth was seen to be inaccessible. Much of what we already know turns out not to be translatable into appropriate truths of physics. The most ambitious response is to conclude, 'So much the worse for what we already (took ourselves to) know'. This is the position known as eliminativism, which holds that to the extent that higher-level sciences cannot be reduced to physics, or at least to a lower-level science in the structural hierarchy, they should be rejected and ultimately replaced with scientific knowledge from the lower level.[John Dupre, Human Nature and the Limits of Science, p. 5,6]

اس کے باوجود سائنس کے بارے میں سابقہ عقیدے کو ترک نہیں کیا گیا Dupre سائنس پرستی

اور علم سائنس کی کاملیت کی قلعی کھولتے ہوئے لکھتا ہے

Although, as I have said, strong forms of reductionism have proved unworkable as a practical way of doing science, the underlying picture that reductionism expresses continues to exercise a profound influence on science. It is still common, for instance, to conceive of genuinely scientific explanation as being necessarily mechanistic.

Mechanism, I take it has proved wonderfully successful at addressing questions about how things work. But when it is taken beyond this limited, if important, role and inflated into a general metaphysical world view it is disastrous. For we do not only want to know how, things work we want to understand what they do , and why. And such questions can usually only be answered by looking at the context in which a thing is situated and the interactions it is engaged in with other things.

These positive theses will be developed at various points in the book. but the main focus will be critical, an exploration of the deep deficiencies of scientific projects motivated by the monistic and reductive metaphysics I reject, as well as of the ways in which this metaphysics works to legitimate these misguided and unsuccessful scienctific projects. [John dupre, Human Nature and the Limits of Science, p. 7,8]

Our minds, once again, lack the necessary computational capacities. But I won't dwell on this response, because the argument here is about the empirical status of claims for the scope of physics. And whatever the status of claims for truths that exceed our computational capacities, they are surely not empirical (for us, anyhow, and who else is there?)

Another common move is to suggest that reductionism is misconceived as a practical goal, but is vital as a regulative ideal of science.

The point might be developed further by suggesting that science thus presupposes the completeness of physics, and since the success of science is evidence for the truth of its presuppositions (inference to the best explanation, perhaps), the success of science is evidence for the completeness of physics. However, I not only reject the premise of this argument, but am also sceptical about its form.[Pag. 9, ibid]

(جاری ہے)

اسلام اور پاکستان

فصیح احمد ☆

# دینی رسالوں کو ہائیڈ پارک نہیں بننا چاہیے

## مولانا زاہد الراشدی صاحب کی خدمت میں چند گزارشات

مولانا زاہد الراشدی صاحب نے نومبر ۲۰۱۳ء کے الشریعہ میں ''الشریعہ اور ہائیڈ پارک'' کے عنوان سے ادارتی کلمات میں راقم کے البرہان ستمبر ۲۰۱۳ء کے شمارے میں شائع ہونے والے مضمون ''تارعنکبوت'' کو اپنے موقف کو موکد کرنے کے لیے پیش کیا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ حضرت والا نے میری تحریر سے وہ نتائج اخذ فرمائے جو راقم کی تحریر کے منشاء، مدعا اور مقصد سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ اس التباس ذہنی یا انتشار فکری کا سبب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ حضرت والا ہر دینی رسالے کو ہائیڈ پارک کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں جہاں ہر رنگ کا پھول کھلا ہو، ہر پرندہ چہچہا رہا ہو اور ہر شخص کو سب کچھ کہنے کی آزادی ہو۔ جس کا بنیادی اصول یہ ہو کہ تم جو کہنا چاہتے ہو آزاد ہو، ہم بھی اس کے رد عمل میں جو کچھ لکھنا چاہیں گے وہ لکھیں گے۔ اس عمل کو محترم راشدی صاحب تلاش حق اور خیر کی جستجو کا نام دیتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اس مکالمے، مباحثے اور تبادلۂ خیال سے خیر کی شناخت آسان اور حق تک رسائی ممکن ہو جاتی ہے۔ اس صدی کے سب سے بڑے فلسفی ہیبر ماس کا خیال بھی یہی ہے۔ اس باطل عمل کو وہ

Intersubjective Communication کہتا ہے ہیبر ماس کے خیال میں ہر مکتب فکر، ہر گروہ اور ہر مفکر کو تبادلہ خیال کے عمل میں شریک کیا جائے۔ اس کے نتیجے میں ایسا خیر برآمد ہو جائے گا جس پر سب کا اتفاق ہوگا۔ مولانا راشدی صاحب نے ہیبر ماس کو پڑھے بغیر ہی اس کے فلسفے کو طائرانہ تعقل کے ذریعے ایک دینی امر بنا دیا ہے۔

ہماری جس تحریر سے راشدی صاحب نے اپنے غلط موقف کی اصولی تائید دریافت کی ہے وہ تحریر ہم دوبارہ ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

> ’’ایک بات ہم مدیر البرہان ڈاکٹر محمد امین صاحب کی خدمت میں بصد احترام عرض کرنا چاہتے ہیں کہ البرہان ایک نظریاتی، تحقیقی اور علمی رسالہ ہے لہٰذا اس رسالے میں مضامین کا چناؤ اور مضامین کی اشاعت کے حوالہ سے بھی علمی تحقیقی رویہ اپنانا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ قارئین کو علمی وفکری انتشار سے بچایا جائے۔ انتشار ذہنی سے بچنے کے لیے اس بات کی کوشش کی جائے کہ ایسے گمراہ کن اور غیر علمی مضمون کو رسالے میں چھاپنے کی ضرورت ہی نہیں اور اگر کسی مصلحت کے تحت کبھی شائع کرنا ضروری ہو تو پہلے کسی اہل علم کو وہ مضمون بھجوا دیا جائے اور ان سے جواب لکھوایا جائے۔ مضمون کا جواب ملنے کے بعد اس مضمون کے ساتھ اس جواب کو بھی شائع کر دیا جائے تا کہ قارئین دونوں کے موقف کو سامنے رکھ کر رائے قائم کر سکیں کیونکہ بسا اوقات قاری ایک ماہ کا رسالہ پڑھنے کے بعد دوسرے ماہ اس کا جواب کسی وجہ سے نہیں پڑھ سکا تو اس قاری کے فکری انتشار یا گمراہی کا ذمہ دار کون ہوگا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ قارئین البرہان کو علمی وفکری انتشار سے بچانے کا اس سے بہتر اور مناسب کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ ہماری عاجزانہ رائے یہ ہے کہ البرہان کو ہائیڈ پارک نہیں بننا چاہیے‘‘۔ [ماہنامہ الشریعہ، کلمہ حق، ص ۲، نومبر ۲۰۱۳ء]

اس تحریر سے درج ذیل اصول مستنبط ہوتے ہیں:

(ا) دینی رسالے کے لیے مضامین کا چناؤ اور اشاعت کا مقصد قارئین کو علمی وفکری انتشار سے بچانا ہونا چاہیے۔

(ب) قارئین کو انتشار ذہنی سے بچانے کے لیے مولانا وحید الدین خاں جیسے گمراہ فرد اور ان

---

☆ استاد اسکول آف لاء، ہمدرد یونیورسٹی، کراچی

کے غیر علمی مضمون کو چھاپنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

(ج) اگر مولانا وحید الدین خاں صاحب جیسے شخص کی تحریر کو کسی مصلحت کے تحت کبھی شائع کرنا ضروری ہو تو پہلے کسی اہل علم کو وہ مضمون بھجوا دیا جائے اور ان سے جواب لکھوالیا جائے مضمون کا جواب ملنے کے بعد اس گمراہ مضمون کے ساتھ اس کا جواب بھی شائع کر دیا جائے تا کہ قارئین دونوں کے موقف کو سامنے رکھ کر رائے قائم کر سکیں۔ یہاں ہم نے خاص طور پر وضاحت کی ہے کہ اگر کسی مصلحت کے تحت کسی گمراہ کن، وغیر علمی مضمون کو شائع کرنا ضروری ہو تب اس حفاظتی طریقے کے ساتھ مضمون کی مجبوراً اشاعت کی جائے۔ اس اشاعت کا مقصد لوگوں کو گمراہ مضمون کی گمراہیوں سے آگاہ کرنا ہو نہ کہ گم راہ مصنف کے خیالات کی اشاعت کرنا۔

(د) گمراہ مضمون اور اس کا جواب ایک ساتھ شائع کیا جائے تا کہ اس مضمون کی گمراہی واضح کر دی جائے اس کا ازالہ وامالہ بھی ہو جائے تا کہ دین کے نام پر پھیلائی جانے والی دینی گمراہیوں کو عوام پر واضح کر دیا جائے۔ یہ کام بھی مصلحت عامہ کے تحت مجبوراً ہی کیا جائے گا اور اس کی حکمت یہ ہے کہ اگر گمراہ مضمون پہلے شائع کر دیا جائے اور اس کا جواب بعد میں تو اس سے گمراہی کا ازالہ نہیں ہو سکے گا۔ اکثر اوقات ایک قاری ایک ماہ کا رسالہ پڑھنے کے بعد کسی مصروفیت یا کسی بھی دوسرے سبب سے اس کا جواب نہیں پڑھتا اور گمراہ مضمون کے سحر کا شکار ہو سکتا ہے، اس صورت میں قاری کی گمراہی کا ذمہ دار کون ہوگا؟ کیونکہ دینی رسالے کا مقصد انتشار اور خلفشار ذہنی عام کرنا نہیں اسے ختم کرنا ہے لہٰذا دینی رسالے کے قارئین کو فکری انتشار سے بچانے کا بہترین طریقہ یہی ہے۔

(ھ) لہٰذا ہماری عاجزانہ رائے یہ ہے کہ دینی رسالے (البرہان) کو ہائیڈ پارک نہیں بننا چاہیے کیونکہ ہائیڈ پارک وہ جگہ ہے جہاں جس کا جو دل چاہے کہہ سکتا ہے۔ اس آزادی اظہار رائے کا کوئی اصول طے شدہ نہیں ہوتا ہر بات اور ہر دعویٰ الحق ہوتا ہے۔ ہائیڈ پارک میں ہر طوطی آواز لگا سکتا ہے۔ وہ متفرق، متنوع اور رنگارنگ آوازوں کا دبستان ہوتا ہے جہاں ہر پرندے کو پرواز کی اور ہر بلبل کو گریبان چاک کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ دینی رسالہ ہائیڈ پارک نہیں بن سکتا وہاں مکالمے، مباحثے اور تبادلۂ خیال کے اصول پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں اور ان اصولوں کے تحت کسی سے بھی مکالمہ ہو سکتا ہے۔ مکالمے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دونوں فریقین کی مابعد الطبیعیاتی اساسات [Metaphysical Foundations] ایک ہوں۔ اس اصول کو طے کیے بغیر مکالمہ مکالمہ نہیں رہتا۔ مناظرے کا اصول بھی یہی ہے کہ فریقین پہلے کسی اصول پر متفق ہو جاتے ہیں جو دونوں کے لیے حجت ہوتا ہے۔ رسالت

م آپ ﷺ نے اسی لیے کفار اور مشرکین کو مکالمے کی دعوت نہیں دی کیونکہ دونوں کے مابین مکالمے کی مشترکہ بنیاد نہیں تھی اور دونوں کی مابعد الطبیعیاتی اساسات یکسر مختلف تھیں لہٰذا ان کو صرف 'دعوت' دی گئی۔ لیکن اہل کتاب کو 'دعوت' بھی دی گئی اور ساتھ ہی ساتھ مکالمے کی بھی دعوت دی گئی کیونکہ اہل کتاب کی ما بعد الطبیعیاتی اساسات اہل ایمان سے مماثل تھیں گو ان میں تحریف ہوگئی تھی۔ توحید کو وہ بھی تسلیم کرتے تھے لیکن ان کی توحید خالص نہیں تھی اس کے باوجود ان کو دعوت ''خالص توحید'' کی بنیاد پر دی گئی کیونکہ وہ التوحید، الکتاب اور الرسول کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح ایک ماں اپنے بیٹے کو پہچانتی ہے۔ یہ دعوت اصلاً اس عہد الست کی یاددہانی تھی جسے ہر شخص روز ازل اٹھا چکا ہے۔ یہ عہد ہر شخص کے ضمیر، خمیر، عقل، قلب، ذہن، وجدان، شعور اور لاشعور میں پیوست ہے اور جب بھی کوئی ہستی کسی فرد کے دروازۂ دل پر دستک دیتی ہے تو یہ عہد ہر انسان کو یاد آ جاتا ہے۔ بہت سے لوگ اس عہد کو یاد کرنے کے بعد بھی بھلا دیتے ہیں یا یاد آنے کے باوجود اس عہد کو پورا نہیں کرتے کیونکہ وہ اپنے نفس کی پرستش میں مبتلا ہوتے ہیں اور وہ اپنی ذات کے معبد میں اپنے نفس کو معبود بنا کر اس کی اتباع و تقلید میں زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں لہٰذا عہد الست کو دانستہ فراموش کر دیتے ہیں۔ رسالت مآب ﷺ نے اہل کتاب سے فرمایا ''قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ'' [۳: ۶۴] اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں کریں گے اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم مسلم ہیں۔ مکالمے اور مباحثے کی طرح مباہلہ کا اصول بھی یہی ہے کہ دونوں فریقین میں کوئی مشترک اساس ہو۔ جب ایک فریق دلیل و برہان کے باوجود ایمان لانے پر تیار نہ ہو تو اسے مباہلے کی دعوت دی جاتی ہے کیونکہ دونوں فریق ایک ہی خدا پر یقین رکھتے ہیں اور دونوں کا خیال یہی ہوتا ہے کہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ لہٰذا مباہلہ کی دعوت اسے دی جاتی ہے جو خدا کے وجود کو تسلیم کرتا ہو۔ کسی ملحد کو مباہلے کی دعوت نہیں دی جاسکتی کیونکہ وہ خدا کو تسلیم نہیں کرتا اور آپ کی دعوت کو قبول نہیں کرے گا۔ باطل فریق اہل کتاب خدا کو اپنا رب مانتے تھے لہٰذا اہل نجران کو دعوت مباہلہ دی گئی ''فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ'' [۳:۶۱] رسالت مآب ﷺ نے کہا آؤ ہم اور تم خود بھی آ جائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ

بِالْمُفْسِدِيْنَ [۳:۶۳] پس اگر یہ لوگ (اس شرط پر مقابلہ میں آنے سے) منہ موڑیں (تو ان کا مفسد ہونا صاف کھل جائے گا) اور اللہ تو مفسدوں کے حال سے واقف ہی ہے۔

اہل نجران کو معلوم تھا کہ رسالت م آب ﷺ سچے ہیں قران اللہ کا کلام ہے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اللہ کی نصرت آپ ﷺ کے ساتھ ہے اگر مباہلہ ہوا تو اللہ کی لعنت ہم پر پڑے گی اور ہمارے گھر والے ہلاک ہو جائیں گے لہٰذا وہ بھاگ گئے ”وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ“[۲: ۸۹] قرآن نے واضح کر دیا کہ اہل کتاب قرآن کو اور اس کے لانے والے کو خوب پہچانتے تھے اور جب وہ آ گیا تو اس سے منکر ہو گئے پس ان منکرین پر اللہ کی لعنت ہے۔قرآن حکیم نے کفار، مشرکین اور اہل کتاب سب سے مناظرے، مکالمے اور مباحثے کے آداب طے کر دیے ہیں کہ یہ مشترکہ اساس کی بنیاد پر ہوں گے۔ اساسات طے شدہ ہیں اگر کوئی ان اساسات، بنیادی مقدمات، ایمانیات اور بنیادی اصولوں کو تسلیم نہیں کرتا تو اس سے مکالمے و مباحثے و مناظرے کے بجائے اس کو دعوت دی جائے گی۔ الشریعہ پر ہمارا اعتراض یہی ہے کہ الشریعہ قرآن، سنت اور اسلامی علمیت کی روشنی میں مکالمے و مباحثے کے طے شدہ اصولوں کو اچھی طرح جاننے کے باوجود ان مکاتب فکر سے مکالمہ و مباحثہ کر رہا ہے جن کے بنیادی اصول، مبادیات اور منہج ہی مختلف ہے مثلاً اہل السنت والجماعت کی مبادیات پر یقین رکھنے والے گروہ کو اہل سنت میں ہی شمار کیا جائے گا اور اس گروہ یا فرد سے مذاکرہ، مباحثہ اور مکالمہ جاری رہے گا لیکن اگر ایک گروہ اور ایک فرد ایک مکتب فکر اہل السنت والجماعت کے بنیادی اصولوں یعنی قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اصطلاحات اہل السنت کی استعمال کرتا ہے لیکن ان کے مفاہیم میں تحریف اور تغیر و تبدل کر کے مکالمہ کرنا چاہتا ہے تو اس سے مکالمہ نہیں ہو سکتا لیکن اس گروہ کو دعوت ضرور دی جا سکتی ہے۔ الشریعہ کا بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ وہ ان گمراہ فرقوں، مکاتب فکر اور اشخاص کی آراء نہایت کروفر سے آزادئ اظہار کے نام پر شائع کر رہا ہے جو گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ اس طرح گمراہی کی تبلیغ، ترسیل اور اشاعت میں نادانستہ طور پر شرکت کر کے وہ دینی حلقوں میں ذہنی انتشار اور فکری خلفشار پھیلا رہا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ان گمراہ افکار کا مسکت جواب لکھنے کے بجائے الشریعہ ان افکار کا دانستہ یا نادانستہ اتنا کم زور جواب دیتا ہے کہ گمراہ فکر کی قبولیت کا دریچہ کشادہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہم نے اپنی تحریر میں اسی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھا تھا:

”دینی علمی رسالوں کو ہائیڈ پارک میں تبدیل کرنے کا کام مولانا زاہد الراشدی صاحب نے الشریعہ کے ذریعہ بخوبی انجام دیا ہے۔ دنیا بھر کی غلط سلط تحریریں

نہایت کروفر کے ساتھ الشریعہ میں شائع ہوتی ہیں۔ انتشار پھیلانے کے اس عمل کو وہ آزادانہ رائے اور علمی ترقی کہتے ہیں۔ موصوف جاوید غامدی صاحب کے نظریات اپنے صاحبزادے کے سائے میں پھیلانے کا کام کررہے ہیں، تجدید دین کے نام پر تجدد عام ہورہا ہے''۔[ماہنامہ الشریعہ،کلمہ حق،ص ۲،نومبر ۲۰۱۳ء]

اس تمہید کے بعد اب مولانا راشدی صاحب کا موقف پڑھیے:

''الشریعہ'' کے بارے میں جناب فصیح احمد کے ارشادات پر کچھ معروضات پیش کرنے سے پہلے ہم ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے علمی وفکری مسائل پر باہمی تبادلۂ خیال اور مباحثہ و مکالمہ کی اہمیت و افادیت کے ساتھ ساتھ دونوں طرف کے مضامین کو ایک ہی فورم پر شائع کرنے کی ضرورت بیان کرکے ہمارے اس موقف کی اصولی طور پر تائید فرمادی ہے کہ علمی وفکری مسائل پر مکالمہ و مباحثہ ہونا چاہیے اور کوئی ایسا فورم بھی ضرور موجود ہونا چاہیے جہاں کسی مسئلہ پر مختلف موقف رکھنے والے دو یا دو سے زائد فریقوں کا موقف یک جا شائع ہو تاکہ قارئین کو سب لوگوں کا موقف سامنے رکھ کر رائے قائم کرنے میں آسانی رہے۔ الشریعہ گزشتہ ربع صدی سے یہی خدمت سرانجام دے رہا ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ ہماری پالیسی پر ناقدانہ نظر رکھنے والے علمی حلقوں میں بھی اس کی اہمیت وضرورت کا احساس پیدا ہورہا ہے، فالحمدللہ علی ذلک۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ''الشریعہ میں گزشتہ ربع صدی کے دوران شائع ہونے والے بہت سے مضامین کی زبان ''ہائیڈ پارک'' اور ''موچی دروازہ'' سے مختلف نہیں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ زبان کس نے استعمال کی ہے؟[ماہنامہ الشریعہ،کلمہ حق،ص ۲، ۳،نومبر ۲۰۱۳ء]

حضرت والا نے ہماری عبارت سے جو معانی اخذ کیے ہیں متن کے فہم سے وہ معانی کسی صورت نہیں پھوٹتے۔ ہم نے درج بالا سطور میں اپنے متن کا فہم دلائل سے واضح کردیا ہے تاکہ ہمارے متن سے گمراہی اخذ کرنے کا کوئی قرینہ باقی نہ رہے، کوئی دریچہ نہ کھل سکے اور ہر امکان مسدود ہوجائے ۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ دینی رسالوں میں بحث ومباحثہ ان مکاتب فکر کے افکار پر ہونا چاہیے جو اہل السنت والجماعت کے اصولوں کو تسلیم کرتے ہوں اور ان مسلمہ اصولوں کے دائرے میں رہ کر اپنے خیالات وافکار پیش کررہے ہوں۔ اگر وہ ان مسلمات کو ہی تسلیم نہیں کرتے اور دین کی تعبیر وتشریح کے نئے اصول تخلیق کرکے اہل السنت والجماعت کی پندرہ سوسالہ قدیم علمیت کے مقابلے میں نئی متوازی علمیت پیش کرتے ہیں تو ان سے مکالمہ نہیں ہوسکتا۔ البتہ ان کو دعوت دی جاسکتی ہے یا ان کو مباہلے کا پیغام دیا جاسکتا ہے۔

اپنے اس موقف کی تائید میں ہم خود حضرت والا مولانا زاہد الراشدی صاحب کی ایک تحریر پیش

کررہے ہیں۔محترم عمار ناصر صاحب کی کتاب ''حدود وتعزیرات۔چنداہم مباحث'' کے''دیباچے'' میں وہ لکھتے ہیں:

۱۔ راقم الحروف کے نزدیک اسلامی قوانین و احکام کی تعبیر وتشریح کے لیے صحیح، قابل عمل اور متوازن راستہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کے اجماعی تعامل اور اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی مسلمات کے دائرہ کی بہرحال پابندی کی جائے [عمار ناصر، حدود وتعزیرات، ص۹، المورد لاہور طبع اول ۲۰۰۸ء]

۲۔جن تقاضوں کو ہم قرآن وسنت کی تعلیمات ،اہل سنت کے علمی اور اجتہاد شرعی کے دائرے میں قبول کرسکتے ہیں انہیں کھلے دل سے قبول کرلیں۔[ص۱۰،محولہ بالا]

۳۔جو امور قرآن وسنت کی نصوص صریحہ،اور اجتہاد شرعی کے مسلمہ اصولوں سے متصادم ہوں ان کے بارے میں کسی قسم کا معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیے بغیر پوری دل جمعی کے ساتھ ان پر قائم رہیں (ص۱۰ محولہ بالا)

۴۔سنت رسول سے مراد وہی ہے جو امت مسلمہ چودہ سو سال سے اس کا مفہوم سمجھتی آ رہی ہے اور اس سے ہٹ کر سنت کا کوئی نیا مفہوم طے کرنا اور جمہور امت میں اب تک سنت کے متوارث طور پر چلے آنے والے مفہوم کو مسترد کردینا بھی عملاً سنت کو اسلامی قانون سازی کا ماخذ تسلیم نہ کرنے کے مترادف ہے(ص۱۰،محولہ بالا)

۵۔صرف قرآن کریم کو قانون سازی کی بنیاد بنانا اور سنت رسول کو قانون سازی کا ماخذ تسلیم نہ کرنا قطعی طور پر نا قابل قبول ہے اور خود قرآنی تعلیمات کے منافی ہے(ص۱۰،محولہ بالا)

۶۔ایک رجحان آج کل عام طور پر یہ بھی پایا جاتا ہے کہ سنت مستقل ماخذ قانون نہیں ہے(ص۱۰ محولہ بالا)

۷۔سنت کو اسلامی قانون سازی کا مستقل ماخذ اور قران وسنت کی تعبیر وتشریح کا حتمی معیار تسلیم کیا جائے جیسا کہ حضرات صحابہ کرام کے دور میں ہوتا تھا اور اسی پر امت مسلمہ کا اجماعی تعامل چلا آ رہا ہے[ص۱۱،محولہ بالا)

۸۔قرآن وسنت دونوں کو قانون سازی کی بنیاد کے طور پر تسلیم کیا جائے۔(ص۱۲ محولہ بالا)

۹۔قدیم وجدید میں تطبیق کی کوشش (احسن کام ہے) صرف ایک شرط کے ساتھ کہ امت کے اجماعی تعامل اور اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی مسلمات کا دائرہ کراس نہ ہو کیونکہ اس دائرے سے آگے بہر

حال گمراہی کی سلطنت شروع ہو جاتی ہے (ص ۱۳، محولہ بالا)

مولانا راشدی صاحب کے ان دلائل سے ہمیں صد فی صد اتفاق ہے۔ ہمارا منشاء بھی یہی ہے کہ الشریعہ اور تمام دینی رسالوں میں انہی اصولوں کے مطابق مباحثے، مکالمے اور مناظرے کا اہتمام ہونا چاہیے تمام علمی تحریریں، اختلافی گفتگو اور تنقیدی آراء اگر قرآن وسنت کی نصوص صریحہ، امت کے اجماعی تعامل اور اہل السنت والجماعت کے علمی مسلمات کے دائرے کے اندر پیش کی جائیں تو ان پر بحث و مباحثے اور گفتگو کا دروازہ کھلا رکھا جائے لیکن الشریعہ اور مولانا راشدی صاحب پر ہمارا بنیادی اعتراض یہی ہے کہ انہوں نے ان طے شدہ اصولوں کے برخلاف گمراہ مکاتب فکر کے خیالات کی اشاعت کو آزادی اظہار رائے کا نام دے کر الشریعہ کو ہائیڈ پارک میں تبدیل کر دیا ہے۔

ان اصولی مباحث پر گفتگو کے بعد جو ہمارے اور راشدی صاحب کے مابین مشترک و متفق علیہ ہیں، اب ہم غامدی صاحب کے مکتب فکر کے افکار کی الشریعہ میں تشہیر، تبلیغ، تدریس اور ترسیل کے حوالے سے جناب مولانا راشدی صاحب کے عذر کا جائزہ لیتے ہیں۔ راشدی صاحب غامدی صاحب کے مکتب فکر کے افکار کی اشاعت کی دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

محترم فصیح احمد صاحب نے جناب جاوید احمد غامدی اور ان کے حلقۂ فکر کے بعض احباب کے مضامین کی ''الشریعہ'' میں اشاعت کا ''طعنہ'' بھی دیا ہے حالانکہ ہم نے غامدی صاحب پر تنقیدات بھی الشریعہ میں شائع کی ہیں، فصیح صاحب نے اسے نظر انداز کر دیا۔ [ماہنامہ الشریعہ، کلمہ حق، ص ۵، نومبر ۲۰۱۳ء]

لیکن راشدی صاحب کا یہ عذر اور یہ دلیل ان کے طے شدہ اصولوں کے منافی ہے۔ غامدی صاحب کے مکتب فکر سے اہل سنت والجماعت کا مکالمہ ممکن نہیں ہے کیونکہ جناب غامدی صاحب کا مکتب فکر اہل السنت والجماعت کے اصولوں کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ سنت کو ماخذ قانون تسلیم نہیں کرتا، وہ اجماع کو ماخذ قانون تسلیم نہیں کرتا، وہ عقل وفطرت کو ماخذات دین کے طور پر قبول کرتا ہے۔ وہ نصوص کی تعبیر وتشریح میں تنوع، رنگارنگی اور تغیرات کا قائل ہے۔ ہمارا سوال صرف یہ ہے کہ ایک مکتب فکر جب سنت کو ماخذ قانون ہی تسلیم نہیں کرتا تو اس مکتب فکر سے مذاکرے ''مباحثے کی بنیاد کیا ہو؟ ایک مکتب فکر خدا اور رسول کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے یا قرآن کو کتاب اللہ تسلیم نہ کرے تو کیا تب بھی ہم اس مکتب فکر کے خیالات علم کی نئی روش، جدید جہت اور منفرد سطح کے طور پر پیش کر کے مکالمہ شروع کر دیں گے؟ ظاہر ہے ہم اس مکتب فکر کو 'دعوت' دیں گے، مکالمہ ومباحثہ ان سے ممکن ہی نہیں کیونکہ وہ ہمارے بنیادی مسلمات کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ غامدی صاحب نے ''میزان'' میں صاف لفظوں میں لکھ دیا ہے:

۱۔ سنت دین ابراہیمی کی روایت ہے۔سنت عبادات، معاشرت، خور و نوش اور رسوم و آداب تک محدود ہے۔سنت محض نماز، روزہ، اعتکاف، زکوٰۃ، صدقہ فطرہ، حج وعمرہ، قربانی، تشریق کی تکبیروں، نکاح وطلاق، حیض و نفاس، سور یا خون، مردار، خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کی حرمت، جانوروں کے تزکیہ، بسم اللہ سے دائیں ہاتھ سے کھانے پینے، السلام علیکم کہنے اور جواب دینے، چھینک پر الحمدللہ جواب میں یرحمک اللہ کہنے، مونچھیں پست رکھنے، زیر ناف کے بال کاٹنے، بغل کے بال اکھاڑنے، ناخن کاٹنے، ختنہ، ناک منہ دانت صاف کرنے، استنجا، حیض و نفاس کے بعد غسل، غسل جنابت، میت کے غسل، تجہیز و تکفین، تدفین، عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کا نام ہے ان سنتوں کی کل تعداد ۱۶ ہے [غامدی میزان، ص ۱۴، طبع پنجم ۲۰۱۰ء المورد لاہور]

۲۔ سنت صرف وہی چیز ہوسکتی ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے دین ہو (اور سنت میں مخفی دین صرف ۱۶ سنتوں میں محصور ہے) سنت کا تمام تر تعلق عملی زندگی سے ہے۔علم وعقیدہ، تاریخ، شان نزول، اور اس طرح کی چیزوں کا سنت سے کوئی تعلق نہیں۔سنت کا لفظ ہی اس سے ابا کرتا ہے کہ ایمانیات کی قسم کی کسی چیز پر اس کا اطلاق کیا جائے لہٰذا علمی نوعیت کی کوئی بھی چیز سنت نہیں ہے۔اس کا دائرہ صرف کرنے کے کام ہیں اور اس دائرے سے باہر کی چیزیں اس میں کسی طرح شامل نہیں کی جاسکتیں۔عملی نوعیت کی وہ چیزیں بھی سنت نہیں ہوسکتیں جن کی ابتداء پیغمبر کی بجائے قرآن سے ہوئی ہے۔سنت قرآن کے کسی حکم پر عمل یا اس کی تفہیم وتبیین کو قرار نہیں دیا جاسکتا۔نفل نماز، روزے، قربانی بھی سنت نہیں فطرت بھی سنت نہیں ہے۔فطرت سنت سے الگ ہے نماز میں قعدے کے اذکار بھی سنت نہیں ہیں۔سنت خبر واحد سے ثابت نہیں ہوتی۔سنت قرآن کی طرح صحابہ کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے لہٰذا سنت بھی قرآن ہی کی طرح پوری قطعیت کے ساتھ متعین ہوجاتی ہے [میزان ص ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱ محولہ بالا] دوسرے معنوں میں جس طرح قرآن کی آیات کی تعداد متعین ہے سنتوں کی تعداد بھی متعین ہے۔

میزان کے مقدمے میں پہلے صفحے پر "اصول ومبادی" کے تحت غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ دین کا تنہا ماخذ اس زمین پر اب محمد ﷺ کی ذات ہے (ص ۱۳ میزان ۲۰۱۰) قانون وحکمت دین حق ہے اور دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے ۱۔قرآن مجید، ۲۔سنت (ص ۱۳ محولہ بالا)۔صفحہ ۷۴ پر غامدی صاحب لکھتے ہیں "سنت قرآن کے بعد نہیں بلکہ قرآن سے مقدم ہے [ص ۷۴ محولہ بالا] سنت دین ابراہیمی کی روایت ہے (ص ۱۴ محولہ بالا)

ان متضاد بیانات میں ترتیب قائم کی جائے تو مآخذ دین کی فہرست جو غامدی صاحب نے مرتب کی

ہے خود ان کے اصولوں کی روشنی میں اس طرح مرتب ہوگی: ۱۔سنت (کیونکہ سنت حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہورہی ہے۔ معلوم نہیں دیگر انبیاء کرام جو حضرت ابراہیمؑ سے پہلے تھے کیا کرتے تھے؟ ان کو تو سنت کا علم ہی نہیں تھا) ۲۔رسالت مآب ﷺ، ۳۔قرآن مجید لیکن غامدی صاحب نے اس ترتیب کو سہواً پیش نظر نہیں رکھا۔

مولانا راشدی صاحب کا اصول یہ ہے کہ سنت ماخذ قانون ہے۔ غامدی صاحب کے مکتب کا اصول ہے کہ وہ ماخذ قانون نہیں ہوسکتی۔اس بنیادی اختلاف کی صورت میں غامدی صاحب کے مکتب فکر اور برادرِ مکرم عمار خان ناصر صاحب کے خیالات پر مکالمہ کیسے ممکن ہے جب بنیادی مقدمات ہی مختلف ہیں۔ایک جانب غامدی صاحب کا دعویٰ ہے کہ سنت قرآن کی طرح قطعی الدلالہ ہے اور صحابہ کے اجماع وعملی تواتر سے متعین ہے لیکن اس تعین، اجماع اور عملی تواتر کا حال یہ ہے کہ (۱) میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء میں سنتوں کی تعداد متعین نہیں تھی۔اس وقت اہل سنت کی تعریفِ سنت سے غامدی صاحب متفق تھے۔(۲) محاضرات کراچی ۱۹ تا ۲۸ مارچ ۱۹۹۸ء میں غامدی صاحب نے سنتوں کی تعداد چالیس بیان کی۔(۳) اصول ومبادی تالیف جاوید احمد غامدی دانش سرا ۱۲۳ بی ماڈل ٹاؤن لاہور طبع اول ۲۰۰۰ء، کے مطابق سنتوں کی تعداد چالیس تھی۔(۴) میزان طبع دوم اپریل ۲۰۰۲ء دارالاشراق ۱۲۳ بی ماڈل ٹاون لاہور میں ص ۱۰ پر اصول ومبادی کے تحت سنتوں کی تعداد صرف ۲۷ رہ گئی۔(۵) میزان طبع اول ۲۰۰۸ء میں سنتوں کی تعداد صرف صرف اٹھارہ رہ گئی۔(۶) میزان طبع پنجم فروری ۲۰۱۰ء میں سنتوں کی تعداد صحابہ کے اجماع وعملی تواتر سے صرف ۱۷ رہ گئی۔(۷) میزان طبع اول ۲۰۰۸ء اور میزان ۲۰۰۹ء میں سنتوں کی تعداد ۱۸ تھی۔ایک سنت جو ۲۰۰۸ء، ۲۰۰۹ء تک صحابہ کے اجماع اور عملی تواتر سے قرآن کی طرح ہی امت کو منتقل ہوئی تھی اچانک ۲۰۱۰ء میں کہاں غائب ہوگئی؟ وہ سنت تھی نومولود کے کان میں اذان۔ ۲۰۱۰ء میں غامدی صاحب کو خبر ہوگئی کہ اس سنت پر صحابہ کا اجماع نہیں تھا اور نہ تواتر عملی تھا لہٰذا یہ سنت خارج کردی گئی؟ غامدی صاحب لکھتے ہیں ''ثبوت کے اعتبار سے سنت اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں۔ وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے سنت اسی طرح ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں مسلمانوں کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے لہٰذا اس کے بارے میں اب کسی بحث ونزاع کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے''۔[میزان ص ۱۴، طبع پنجم ۲۰۱۰ء] تو سوال یہ ہے کہ سنت اتنی قطعی، واضح اور قرآن کی طرح مستحکم تھی تو ۲۰۱۰ء میں وہ کیسے منسوخ ہوگئی؟ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ صحابہ کا اجماع اور عملی تواتر بھی منسوخ ہوسکتا ہے اور قرآن کی آیات کی تعداد بھی کم وبیش ہوسکتی ہے جس طرح سنت کی تعداد کم زیادہ ہورہی ہے۔ ماخذ نا قابل تغیر ہوتا ہے اگر

سنت ماخذ ہے تو یہ کیسا ماخذ ہے جو مسلسل تغیر و تبدل سے گزر رہا ہے۔

۳۔ غامدی صاحب دین کے صرف دو ماخذ تسلیم کرتے ہیں قرآن و سنت۔ وہ قیاس اور اجماع کو ماخذ تسلیم نہیں کرتے۔ ان کی نظر میں سنتوں کی تعداد صرف ۱۷ ہے۔ قرآن کی تشریح و تفسیر کے ضمن میں وہ سنت کو ماخذ تسلیم نہیں کرتے کہ سنت تو صرف اعمال کا نام ہے علم، قانون، اصول، تشریح و تفسیر کا نام نہیں۔ اصلاً غامدی صاحب کا ماخذ دین صرف اور صرف قرآن ہے۔ وہ سنت کو ماخذ قانون و ماخذ تفسیر قرآن تسلیم نہیں کرتے۔ منکر سنت کے بارے میں خود راشدی صاحب کی رائے یہ ہے کہ ''صرف قرآن کریم کو قانون سازی کی بنیاد بنانا اور سنت کو قانون سازی کا ماخذ تسلیم نہ کرنا قطعی طور پر نا قابل قبول اور خود قرآنی تعلیمات کے منافی ہے [ص ۱۰ دیباچہ حدود و تعزیرات عمار ناصر طبع اول جولائی ۲۰۰۸ء]۔ غامدی صاحب اور ان کا مکتب فکر بشمول محترم عمار ناصر صاحب جب سنت کو ماخذ قانون ہی نہیں مانتے تو قرآنی تعلیمات کے خلاف غلط نقطۂ نظر بھی رکھتے ہیں تو ان کی تحریروں کی الشریعہ میں اشاعت کا کیا جواز ہے؟

الشریعہ پر ہمارا اعتراض یہی ہے کہ وہ ہائیڈ پارک نہ بنے، قرآن و سنت اور اجماع و قیاس کے اصولوں کا محافظ بنے۔ جدیدیت پسندوں اور منکرین سنت کے افکار کو اپنے رسالے کی زینت بنا کر ان کو اعتبار و وقار اور اعتماد مہیا نہ کرے یہ دین کے ساتھ مذاق ہے اور اپنے طے شدہ اصولوں کا انکار۔ قرآن نے یہی بات واضح کی ہے کہ اے ایمان والو تم وہ باتیں کیوں کہتے ہو جن پر خود عمل نہیں کرتے۔ (جاری ہے)

اسلام اور پاکستان

محمد رشید ☆

# غلبۂ اسلام بذریعہ احتجاجی سیاست

## تنظیم اسلامی کی خدمت میں چند گزارشات

تنظیم اسلامی پاکستان غلبۂ اسلام کی داعی جماعت ہے جو جماعت اسلامی کے ''ایمانی، اخلاقی اور دعوتی روح کے بحران'' سے دلبرداشتگی کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ (دیکھیے اسلام کی نشاۃ ثانیہ۔ کرنے کا اصل کام از ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم، ''تعارف تنظیم اسلامی'' نامی کتابچہ اور ''تاریخ جماعت اسلامی'' از ڈاکٹر اسرار احمد)۔ مذکورہ بالا کتابچے، جو تنظیم کے مقصد وجود کو سمجھنے میں محوری حیثیت رکھتے ہیں، نہ صرف نہایت شد و مد سے احیائے اسلام کی شرط لازم کے طور پر ایک زوردار تحریک ایمان پر صلاحیتوں کو مرکوز

کرنے پر زور دیتے ہیں بلکہ آخرت کو نصب العین بناتے ہوئے اتباع سنت کی بنیاد پر کردار سازی اور تزکیہ واصلاح پر زبردست اصرار کرتے ہیں۔ تنظیم اسلامی کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ یہ دعوت وتزکیہ کے ہر ہر مرحلے میں قرآن حکیم کو محوری حیثیت دینے کی داعی ہے۔ان خوبیوں پر مستزاد اس تنظیم کی ایک اور خوبی اس کے بانی ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم ومغفور کی غیر معمولی قوتِ بیان تھی۔ یہ وہ بنیادی خوبیاں ہیں جو معاشرے کی فرسودگی، بے راہ روی، بے مقصدیت اور بگاڑ سے نالاں افراد کو تنظیم کی طرف کھینچ کر لے آتی ہیں۔

لیکن یہ ایک المیہ ہے کہ وہ تنظیم جو جماعت اسلامی کے ’’ایمانی، اخلاقی اور دعوتی سپرٹ کے بحران کے نتیجے میں وجود میں آئی، معاشرے کی ذہین اور بے چین روحیں جب اپنی ایمانی، اخلاقی، دعوتی اور روحانی پیاس بجھانے اس تنظیم کے دامن میں آکر پناہ گزیں ہوتی ہیں تو بہت جلد ’’ایمانی، اخلاقی اور دعوتی سپرٹ کے بحران‘‘ کے ایک منفرد اور تکلیف دہ مرحلے سے ان کا واسطہ پڑتا ہے۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے کہ ایسے بے چین اور مخلص افراد اپنے جسم وروح کی گہرائیوں سے اس ’’بگاڑ‘‘ کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے اول وآخر زور کردار سازی اور قول وفعل کی ہم آہنگی کے لیے تزکیہ وتعمیر سیرت پر اپنی صلاحیتوں کو مرکوز کرنا چاہتی ہیں۔ یہ بے چین ومخلص افراد قرآن حکیم، سیرت نبوی اور تنظیم اسلامی ہی کے بنیادی لٹریچر اور مقصد وجود سے استدلال کرتے ہوئے تنظیم اسلامی میں در آنے والے بگاڑ پر قابو پانا

---

☆ (abu_munzir1999@yahoo.com)

چاہتے ہیں، تنظیم کی مساعی کو انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت اصلاح وتزکیہ کے منہاج پر ڈال کر، تنظیم اسلامی کو معاشرے میں پاکیزہ تبدیلی کی ایک طاقتور آواز اور ایک یکسو پلیٹ فارم بنانا چاہتے ہیں۔لیکن اپنی ان نہایت صالح، مقدس اور مبارک آرزوؤں اور عزائم کے باوجود انہیں ٹکراؤ کی لائن پر لگا دیا جاتا ہے۔

افراد ہو یا جماعتیں خود احتسابی کے بغیر ترقی اور روحانی ترفع ناممکن ہے۔مگر خود احتسابی کے لیے ایک بیدار اور طاقتور ضمیر کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ جماعتوں اور معاشروں کا ضمیر وہ صالح افراد ہوا کرتے ہیں جو جماعتوں اور معاشروں کے قول وفعل کے تضادات اور انحرافات کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھ دیتے ہیں اور اس کی اصلاح کے لیے قول حق کا فریضہ پوری دیانتداری سے ادا کرتے ہیں۔خوش نصیب ہیں وہ معاشرے اور وہ جماعتیں جو اپنے ضمیر (قول حق کا فریضہ ادا کرنے والے اصحاب خیر اور جماعتوں کے بگاڑ سے لڑنے والے اصحاب عزیمت) کا گلا گھونٹنے سے نہ صرف اجتناب برتتے ہیں بلکہ اس ’’مبارک ضمیر‘‘ کو، بگاڑ کے آگے بند باندھنے اور اصلاح کی راہ ہموار کرنے کے لیے، اپنا فریضہ ادا کرنے کی مکمل

آزادی عطا کرتے ہیں۔اور خوش نصیبی سے محروم ہیں وہ معاشرے اور جماعتیں جو اس ''ضمیر'' کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتی ہیں، اپنے تضادات اور انحرافات کو منطق کے زور پر منوانے کی کوشش کرتی ہیں اور اصلاح کی ہر آواز کو اجنبی جان کر اسے ''شہر بدر'' یا کم از کم ''جماعت بدر'' کرنا اپنا حق سمجھتی ہیں۔ایسے حالات میں مخلص مگر بے چین روحوں کی کیفیت کو کسی حد تک اس شعر سے سمجھا جا سکتا ہے ؎

ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیماں بھی　　عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے

درد اتنا کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا　　سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

تنظیم اسلامی، جو ہماری نگاہوں میں نہایت محترم جماعت ہے، جس کے ہم دس سال تک ''رفیق'' بھی رہے ہیں، گزشتہ کئی سالوں سے ایک نہایت سنگین مغالطہ میں مبتلا ہو چکی ہے۔معاملہ کی سنگینی اس وقت دو آتشہ ہو جاتی ہے جب وہ اس مغالطہ پر نہ صرف مسلسل اصرار کرتی ہے بلکہ عصر حاضر میں غلبہ اسلام کے لیے اسے اپنی ایک بہت بڑی دریافت بھی سمجھتی ہے اور تمام اسلامی تحریکوں کو اس کی پیروی کی دعوت بھی دیتی ہے۔

ہماری رائے میں تنظیم اسلامی کے ذمہ داروں کو درج ذیل مغالطے لاحق ہیں:

**مغالطہ نمبر ۱:** اسلام کا نفاذ اور غلبہ خون بہائے بغیر ممکن نہیں ہے۔لہٰذا نبی اکرم ﷺ کے دور میں بھی مسلح قتال ہوا تب جا کر اسلام کو غلبہ ملا۔

**مغالطہ نمبر ۲:** عصر حاضر کی تمدنی و معاشرتی تبدیلیوں نے اجتہاد کے ذریعے مسلح قتال کا متبادل غیر مسلح قتال بمعنی پُرامن احتجاجی تحریک کے منہاج کو اسلام کے غلبہ کے لیے اختیار کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

**مغالطہ نمبر ۳:** عصر حاضر میں اسلام کے غلبہ اور نفاذ کا یہ نہایت درست منہاج ہے جسے تنظیم اسلامی نے دریافت کیا ہے اور اسے ٹھوس دلائل و براہین سے واضح کیا ہے جبکہ دوسری عصری اسلامی تحریکوں کے ہاں احیائے اسلام کے اس آخری مرحلہ کے معاملہ میں فکری خلا اور فقدان پایا جاتا ہے۔

تعبیر کی غلطی کی بنیاد پر قائم ہونے والے ان مغالطوں سے قطع نظر تنظیم اسلامی کے امیر محترم حافظ عاکف سعید صاحب کے حالیہ خطاب کے مندرجات ہمیں ورطہ حیرت ڈال دیتے ہیں۔یہ خطاب جو ۲۳ جون ۲۰۱۳ء کو کراچی میں ''پاکستان میں اس کے قیام سے اب تک......احیائے اسلام کی کوششوں کا جائزہ'' کے عنوان سے کیا گیا، ماہنامہ میثاق کی اکتوبر ۲۰۱۳ء کی اشاعت میں طبع ہوا ہے۔وہ مولانا مودودی مرحوم کی ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۴۸ء میں شائع ہونے والی ایک نہایت اہم تحریر کا حوالہ دیتے

ہیں، جس میں مولانا مرحوم نے فرمایا کہ:

''واضح طور پر سمجھ لیجیے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے۔''

اس کے بعد سید مودودی مرحوم پہلے طریقے کی وضاحت کرتے ہوئے ''انتخابات'' کو ایک عارضی اور آزمائشی طریقہ کے طور پر ذکر کرنے کے بعد دوسرے طریقے کی تفصیل ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

''دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعے سے اس میں خالص اسلامی شعور وارادہ کو بتدریج اس حد تک نشوونما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آجائے۔''

اس کے بعد مولانا نے تحریر فرمایا کہ ہم اس وقت پہلے طریقے کو آزما رہے ہیں اگر اس میں ناکام ہوئے تو ہم دوسرے طریقے کی طرف لوٹ جائیں گے۔

جناب عاکف سعید صاحب نے اس تحریر کا حوالہ دینے کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ: ''اس اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ بہرحال یہ دو طریقے ہیں اور قیام پاکستان کے بعد جس طریقہ کار (یعنی انتخابات کے ذریعے نفاذ شریعت) کو اختیار کیا گیا وہ وقتی طور پر تھا بایں طور کہ اگر کامیابی نہیں ملتی تو ہم پھر واپس پہلے طریقے (یعنی انقلابی تحریک کے ذریعے نفاذ شریعت) کی طرف جائیں گے''

حیرت کی بات یہ ہے کہ سید مودودی مرحوم ومغفور غلبۂ اسلام کے جس طریقے کو اپنی تحریر میں بغیر کسی رنگ آمیزی کے دین کی خالص اور سادہ اصطلاح کی ترجمانی کرتے ہوئے ''عمومی تحریک اصلاح '' کے واضح عنوان سے ذکر فرما رہے ہیں جناب عاکف سعید صاحب سید مودودی مرحوم کی تحریر کے مندرجات درج کرنے کے باوجود اس دوسرے طریقے کو اس کا اصل نام دینے سے کترا جاتے ہیں اور مولانا مودودی کی ترجمانی کرتے ہوئے اس طریقے کو ''انقلابی تحریک کے ذریعے نفاذ شریعت'' کے نام سے بدل دیتے ہیں۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں یہ ایک طویل قصہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو ذہن دین کا مطالعہ خالص قرآنی تناظر میں اور انبیاء کرام علیہم الصلوۃ کے حوالے سے کرے گا وہ لازماً دینی جدوجہد کا وہی عنوان اختیار کرے گا جو سید مودودی مرحوم ومغفور نے اوپر کی سطور میں کیا ہے۔ جبکہ جو ذہن دین کا مطالعہ عصری مطالعات اور سیاسی ومعاشی تصورات کی روشنی میں کرے گا اسے دینی جدوجہد کے لیے ''عمومی تحریک اصلاح '' کا عنوان ایک کمتر، فروتر اور حقیر عنوان محسوس ہوگا لہٰذا وہ اس کی بجائے ''انقلاب اور انقلابی تحریک'' کا

عنوان اختیار کرنے میں فخر محسوس کرے گا۔واضح رہے کہ تحریک اصلاح کا عنوان توجہات کو انفرادی واجتماعی اصلاح پر مرکوز کرانے پر زور دیتا ہے جبکہ ''انقلابی تحریک'' کا لفظ توجہات کو اصلاح کے اہم ترین فریضہ سے ہٹا کر باتوں کا تیس مار خاں اور مستقبل کے خیالی نقشے کی بحث وتمحیص میں گم کر دیتا ہے۔

اسلامی انقلاب کا لفظ اگر کسی خاص دور میں گمراہ تحریکوں اور فلسفوں سے ہٹا کر نوجوانوں کو اسلام کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اختیار کیا گیا تھا تو اب وہ دور گزر چکا اور اب یہ لفظ اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ کیونکہ روس کا کمیونزم دفن ہو چکا۔گزشتہ کئی عشروں سے تیسری دنیا کے ممالک کے باسیوں کو جمہوری انقلاب اور بالشویک انقلاب کے جن خوشنما نعروں سے لبھایا گیا تھا، اب ان ممالک کے عوام پر ان خوشنما نعروں کی قلعی کھل چکی ہے۔ دنیا یہ جان چکی ہے کہ انقلاب محض فساد کا دوسرا نام ہے۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں آج تک انقلاب کے نام پر کوئی مثبت تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ ہر انقلاب پہلے سے موجود ظالم طبقہ کو نیست نابود کر کے دوسرے ظالم طبقہ کو اپنے اوپر مسلط کرنے پر منتج ہوا۔ دو تین عشرہ پہلے لفظ انقلاب میں اگر کوئی معنویت اور کشش تھی بھی تو آج کے انسان کے نزدیک یہ ایک فرسودہ، پٹا ہوا اور لایعنی لفظ بن چکا ہے۔ ہر گمراہ، ہر ظالم اور ہر جھوٹا سیاسی رہنما عوام کی گردنوں پر سوار ہونے کے لیے اسی لفظ کا سہارا لیتا ہے اور پھر انسانوں کے دکھوں اور تکلیفوں کا نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید متمدن دنیا کی دجالی تہذیبوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک کی وجہ سے انیسویں اور بیسویں صدی میں نوع انسانی پر راج کرنے والا یہ لفظ قرآن وسنت اور بارہ سو سالہ تاریخ پر محیط اسلامی لٹریچر میں کہیں بھی مثبت معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ یہ لفظ آج اکیسویں صدی میں اپنی افادیت کھو چکا ہے۔لوگ اس لفظ میں چھپی ہوئی خون آشامی، فساد، دھوکہ اور ''پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات'' کے چھپے ہوئے چہرے کا شعوری یا لاشعوری طور پر ادراک کر چکے ہیں۔ ہماری رائے میں اکیسویں صدی میں غلبۂ اسلام کے لیے کی جانے والی کسی بھی کوشش کے لیے بطور اصطلاح اور بطور سلوگن ''انقلاب'' کے لفظ کو اختیار کرنا......اس کوشش اور جدوجہد کو غیر سنجیدہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ طرز عمل درحقیقت طرز کہن پہ اڑنا، بدلتے ہوئے زمانے اور حالات سے ناواقفیت، دین کی روح اور اس کے قالب کو داؤ پر لگائے بغیر اس کو بہتر سے بہتر اور خوبصورت سے خوبصورت الفاظ میں پیش کرنے کی صلاحیت کے فقدان کی غمازی کرتا ہے۔

پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ اصلاح کے لفظ سے عاجزی، انکساری، عبدیت اور انسانی ہمدردی وغمخواری کی جھلک نمایاں ہوتی ہے جبکہ انقلاب کے لفظ سے ہی غرور، تکبر، نخوت، خون خرابہ، تباہی اور بربادی کے پیغام نشر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام عبدیت، تقویٰ اور اصلاح کا نعرہ بلند کیا کرتے تھے جبکہ جدید دنیا کا ہر ظالم اور آمر انقلاب کی صدا بلند کرتا ہے۔ چنانچہ دین کی دعوت دیتے

ہوئے ''اصلاح'' کا لفظ استعمال کرنے میں ہمیں شرم محسوس ہوتی ہے کیونکہ اس میں عاجزی، انکساری اور عبدیت کا اظہار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے جبکہ ''انقلاب'' کے لفظ کی ادائیگی ہی سے ہمارے لہجوں میں سختی، رعونت، رعب اور فخر پیدا ہو جاتا ہے۔

جناب عاکف سعید صاحب اپنے زیر بحث خطاب میں ایک اور دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ مولانا مودودی نے جس انقلابی جدوجہد کے ابتدائی مراحل واضح کیے، جناب ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم نے اسی انقلابی جدوجہد کے تکمیلی مراحل واضح کیے۔ اور اس کی تصویب ہمارے روایتی علماء کا ایک بہت اہم اور مضبوط حلقۂ دیوبند بھی کر چکا ہے۔ (صفحہ ۵۳ ماہنامہ میثاق اکتوبر ۲۰۱۳ء)

تنظیم کے ابتدائی تشخیصی اور بنیادی موقف اور اعلانیہ پروگرام سے متضاد یہ وہ اعلان ہے جسے تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے پیہم اصرار اور تکرار سے بیان کیا جاتا ہے۔ یعنی سید مودودی مرحوم مغفور نے احیائے اسلام کے لیے جس ''عمومی تحریک اصلاح'' کا ذکر کیا ہے وہ نام نہاد ''انقلابی جدوجہد'' کا ابتدائی مرحلہ ہے جبکہ اس مجہول الاسم ''انقلابی جدوجہد'' کا تکمیلی مرحلہ وہ ہے جسے جناب ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم نے منہج نبوی ﷺ اور سیرت نبوی ﷺ کے اہم مرحلہ ''قتال فی سبیل اللہ'' میں اجتہاد کرتے ہوئے پُرامن احتجاجی تحریک کو ''غیر مسلح تصادم'' کے عنوان سے شدومد اور نہایت تکرار و اصرار سے قبول کرانے کی دعوت دی۔

اس فکر کا گہرائی میں اتر کر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ یہ فکر اصل میں سید مودودی مرحوم و مغفور کے نہایت صائب تجزیہ اور دعوتِ قرآنی و دعوت انبیاء کے نہایت درست ترجمانی کے حامل الفاظ یعنی احیائے دین کے لیے ''عمومی تحریک اصلاح'' کو اپنی فاخرانہ نفسیات اور عصری گمراہ تحریکوں (اور ان سے مرعوب و متاثر اسلامی تحریکوں) کے نہایت مرغوب اور محبوب لفظ ''انقلاب'' کے مقابلہ میں ایک فروتر اصطلاح سمجھتی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر تحریک اصلاح جیسے ہمہ گیر و ہمہ پہلو زبردست ایمانی و قرآنی سوچ کے علمبردار لفظ کو نام نہاد ''انقلابی جدوجہد'' کے محض ابتدائی مرحلہ میں مقید کر کے تکمیلی مرحلہ کے لیے ''غیر مسلح تصادم'' کا عنوان پسند کرتی ہے۔ اور اس عنوان کے تحت پُرامن احتجاجی تحریک کو اس نام نہاد انقلابی جدوجہد کی تکمیلی شان قرار دیتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ دعویٰ بھی کیا جا رہا ہے کہ اس controvertial فکر کی ''تصویب ہمارے روایتی علماء کا ایک بہت اہم اور مضبوط حلقۂ دیوبند بھی کر چکا ہے''۔ اور اپنے اس دعویٰ کے ثبوت کے طور پر حلقۂ دیوبند کے سرکردہ علماء کے اجلاس کا وہ اعلامیہ پیش کیا جاتا ہے، جس میں یہ نصیحت کی گئی ہے کہ:

''پاکستان کی تمام سیاسی اور دینی جماعتوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے دوسرے مقاصد پر

نفاذ شریعت کے مطالبے کو اولیت دے کر حکومت پر دباؤ ڈالیں اور اس غرض کے لیے موثر مگر پُرامن جدوجہد کا اہتمام کریں۔'' (ماہنامہ میثاق صفحہ ۹۸)

حلقہ دیوبند کے علماء کے اعلامیے کا جو حوالہ ماہنامہ میثاق میں دیا گیا ہے جب ہم اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو ''غیر مسلح تصادم'' نامی فلسفہ اور اسے منہج نبوی ﷺ کے آخری مرحلہ کے طور پر قبول کرنے کا کوئی ذکر ہمیں نہیں ملتا۔ زیادہ سے زیادہ درج بالا الفاظ ہیں جن کی بنیاد پر جناب عاکف سعید صاحب فرماتے ہیں کہ:

''بڑی خوشی کی بات ہے کہ ایک بہت بڑے مکتبۂ فکر نے اس طریقہ کار کی تصویب فرمائی ہے۔''

اسے ہماری کم فہمی کہا جاسکتا ہے کہ نہ ہی ہمیں حلقہ دیوبند کے مذکورہ بالا اعلامیے میں ''انقلابی جدوجہد'' نظر آرہی ہے اور نہ ہی غیر مسلح تصادم نامی کسی فلسفہ کی تصویب وتائید میسر ہورہی ہے۔ اگر کسی صاحب فہم وذکاء کو سید مودودی مرحوم کے سابقہ سطور میں مذکور موقف یعنی ''عمومی تحریک اصلاح'' کا مفہوم انقلابی تحریک کے ذریعے نفاذ شریعتا ور حلقہ دیوبند کے اعلامیے میں بیان کیے گئے موقف ''نفاذ شریعت کے مطالبے کو اولیت دے کر حکومت پر دباؤ ڈالیں اور اس غرض کے لیے موثر مگر پُرامن جدوجہد کا اہتمام کریں'' میں ''غیر مسلح تصادم'' نامی کسی فلسفے کی تائید وتصویب سمجھ میں آرہی ہو تو ہماری دست بستہ گذارش ہے کہ وہ ہمیں بھی یہ بات سمجھا دیں۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ تنظیم اسلامی کا دعویٰ ہے کہ منہج نبوی کے تناظر میں جدید دور میں ''پُرامن احتجاجی تحریک'' ہی غلبۂ اسلام کی سب سے صائب اور درست راہ ہے لہٰذا اس منہج سے اسلام کا مکمل غلبہ اور نفاذ ممکن ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ یہ نقطۂ نظر اور دعویٰ کس حد تک معقول ہے؟ اور یہ کہ نبی اکرم ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کی محکم نصوص، خاص طور پر قتال فی سبیل اللہ کے قرآنی حکم میں ''اجتہاد'' کے نام سے کسی تبدیلی کی دعوت دینا کوئی علمی اور معقول طرز عمل ہے؟ ہم اس سوال سے بھی بحث نہیں کرتے کہ کیا جہاد/ قتال فی سبیل اللہ کا منہاج نبوی ﷺ یا دین میں وہی محل اور مقام ہے جو مقام اسے تنظیم اسلامی کے بانی ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کئی عشروں تک اپنے دروس میں دیتے رہے؟ ہمارا سوال یہ ہے کہ جب ایک ذہن اپنے آپ کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ جدید متمدن دنیا کی عطا کردہ آزادیوں میں سے ایک آزادی یعنی اپنے مطالبات کے حق میں ''احتجاج'' یا احتجاجی سیاست کی آزادی کو ''غیر مسلح تصادم'' کا عنوان دے کر اسے باطل قوتوں سے مقابلہ وتصادم کے نام پر منہج انقلاب نبوی کے آخری مرحلے کے طور پر قبول کرانے کی دعوت دے تو وہ کسی دوسرے ذہن اور گروہ کو اپنا یہ حق استعمال کرنے کی اجازت کیوں نہیں دیتا کہ وہ اسی جدید متمدن دنیا کی عطا کردہ آزادیوں میں سے ایک آزادی یعنی اپنے دینی مطالبات

کو عملی شکل دینے کے لیے الیکشن یعنی انتخابی سیاست کے ذریعہ اختیار کرے اور اسے باطل قوتوں سے مقابلہ اور کر کفر و اسلام کی جنگ میں اترنے کا نام دے۔ سوال یہ ہے کہ طریق کار کے چوائس کے ضمن میں جو حق اور آزادی آپ اپنے لیے استعمال کرتے ہیں تو آپ کس اتھارٹی اور دلیل کی بنیاد پر دوسروں سے اپنی رائے سے مختلف طریق کار اختیار کرنے پر ان سے چوائس کا حق چھین لینا چاہتے ہیں؟ کیا ''احتجاجی سیاست'' آسمان سے اترا ہوا کوئی صحیفہ ہے جس کو مضبوطی سے تھام لینے کی صبح شام آپ دعوت دیے چلے جارہے ہیں؟ اور کیا ''انتخابی سیاست'' قرآن و سنت کی کسی بھی نص سے ''کارحرام'' ثابت ہوتا ہے جسے آپ دینی جماعتوں کے لیے شجر ممنوعہ ثابت کرنے میں عقل و منطق کی کوئی بھی دلیل رائیگاں نہیں جانے دیتے؟

سوال یہ بھی ہے کہ آخر ''انتخابی سیاست'' میں وہ کون سی برائی ہے جس سے ''احتجاجی سیاست'' بالکلیہ پاک ہے۔ ''انتخابی سیاست'' اور ''احتجاجی سیاست'' دونوں ہی جدید تمدنی دنیا کی عطا ہیں۔ یہ دراصل مغرب کی متمدن و مہذب دنیا کے متفق علیہ ''جمہوری نظام'' کے اہم ارکان اور اعضاء ہیں جبکہ پچھلے دو سو سال کا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ عالم مغرب یہ اٹل فیصلہ کر چکا ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں ریاستی سطح پر اسلام کے سیاسی و معاشی احکام و قوانین کو نافذ کرنا ناممکن کر دیا جائے۔ مغرب کے مقتدر طبقات یہ طے کر چکے ہیں کہ ان کی حیا باختہ، خدا بے زار اور مادہ پرست دجالی تہذیب کا سب سے بڑا دشمن، سب سے بڑا حریف اور سب سے بڑا مخالف اسلام ہے۔ بقول اقبال ابلیس عالم مغرب کے مقتدر طبقات اور اپنے چیلوں کے دل و دماغ میں یہ خوف پیوست کر چکا ہے۔

لہٰذا عالم مغرب کا مقتدر طبقہ یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ اسلام پسند چاہے کوئی سا بھی ذریعہ اور راستہ اختیار کریں، چاہے وہ انتخاب کا ذریعہ اختیار کریں، چاہے احتجاج کا یا کوئی اور...... ریاست کی سطح پر اسلام کا راستہ ہر حال میں روکنا ہے۔ عالم مغرب کی اسلام پسندوں پر نہایت گہری نگاہ ہے اور وہ اسلام پسندوں کو کسی قیمت پر یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اسلام پسند ''جمہوری نظام'' کے اہم آلات یعنی انتخابی سیاست یا احتجاجی سیاست کو بروئے کار لا کر اسلام کے نفاذ اور غلبہ کو ممکن بنائیں۔ اپنے اس فیصلے پر مغرب اس حد تک مصر اور جذباتی ہے کہ اس کی خاطر بالفرض اسے ''جمہوری نظام'' کی جان یعنی انتخابی سیاست کا گلا دبانا پڑے تو وہ بلا توقف ایسا کر گزرتا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے جس جس خطے میں اسلام پسند اپنی بہترین حکمت عملی اختیار کر کے بذریعہ ''انتخابی سیاست'' حکومت بنانے کے قابل ہوئے مغرب کے گماشتوں نے ان کا تختہ الٹ دیا اور انہیں بندگلی میں دھکیل دیا۔ یہ وہ حقائق ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ جدید و متمدن دنیا کے عالمی شیطان، اگر اسلام کی راہ روکنے کے لیے اپنے ہی ''جمہوری نظام'' کی جان یعنی انتخابی سیاست کا گلا گھونٹ سکتے ہیں تو وہ اپنے اسی مقصد کی خاطر ''جمہوری نظام'' کے ایک اہم

عضو یعنی ''احتجاجی سیاست'' کا گلا دبانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ مصر کے تجربہ نے تو یہ بات ثابت کردی ہے کہ مغرب کے عالمی شیطان اور ان کے آلہ کاروں نے نہ صرف مصر میں ''جمہوری نظام'' کی جان یعنی انتخابی سیاست کا گلا کاٹ کے رکھ دیا بلکہ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ''احتجاجی سیاست'' کا گلا دبانے میں بھی کامل درندگی، اور شیطانت کا مظاہرہ کیا۔ کیا اب بھی کسی کو یہ غلط فہمی ہے کہ غلبۂ اسلام بذریعہ ''احتجاجی سیاست''، ممکن ہے؟ ہماری رائے میں ایسا سوچنے والے کے لیے نرم سے نرم الفاظ ''انتہا درجے کی سادگی اور بھولا پن'' ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ مغرب کے جمہوری نظام کے اس اہم رکن یعنی ''احتجاجی سیاست'' کو غلبہ اسلام کے نبوی ﷺ منہاج کے تکمیلی مرحلہ یعنی قتال فی سبیل اللہ کا متبادل قرار دے کر اس کا نام غیر مسلح تصادم رکھ دیا جائے، یہ ہمارے نزدیک انتہا درجے کا مغالطہ ہے جس کے ڈانڈے گمراہی سے جا ملتے ہیں۔

بھلا بتایا جاسکتا ہے کہ مسلم اکثریتی علاقوں، خاص طور پر پاکستان میں، جس کے آئین میں ''قرآن وسنت'' کی بالادستی اور حاکمیت کو تسلیم کیا گیا ہے، نظام کی وہ کون سی تبدیلی ہے جو مسلم جماعتیں بذریعہ انتخابات دوتہائی اکثریت حاصل کرنے کے بعد روبہ عمل نہیں لاسکتیں اور محض احتجاجی سیاست ہی کے ذریعہ سے لائی جاسکتی ہیں۔ انتخابات میں حصہ لینے پر اسلامی تحریکوں پر جو جو فرد جرم عائد کی جاتی ہے مثلاً اخلاقی، ایمانی، شرعی امور میں مداہنت سے کام لینا، تعمیر سیرت، تزکیہ وتربیت اور دعوت دین سے غفلت برتنا، مروجہ سیاسی ہتھکنڈوں اور برائیوں کو اختیار کر لینا وغیرہ وغیرہ تو کیا بتایا جاسکتا ہے کہ احتجاجی سیاست یا ''احتجاجی تحریک'' کے منہاج میں بالقوہ وہ کون سی خوبی ہے کہ اس کو اپنانے والی جماعتیں ان برائیوں سے محفوظ رہیں گی؟ اسلامی جماعتوں کو غلبہ اسلام بذریعہ انتخابی سیاست ناکامی کے جتنے امکانات ہیں کم وبیش اتنے ہی امکانات ناکامی کے غلبہ اسلام بذریعہ ''احتجاجی سیاست'' / غیر مسلح تصادم میں بھی ہیں۔ یہاں اس موضوع پر پیش کیے جانے والے تمام دلائل کا تجزیہ کرنا مقصود نہیں۔ یہ موضوع ایک الگ تفصیلی مقالہ کا متقاضی ہے۔

## پس چہ بائید کرد

ہم پاکستان میں رہنے والوں اور یہاں کی دینی جماعتوں کا اصل المیہ اور اصل روگ یہ ہے کہ ہم نفاذ اسلام اور غلبہ اسلام کے نعرے تو بہت لگاتے ہیں، اس پر تقاریر اور خطابات کرتے ہوئے بھی نہیں تھکتے، اس کے طریق کار پر مباحثے اور مذاکرے منعقد کرنے میں بھی ہمیں بہت لطف ملتا ہے۔ ہم میں کچھ لوگ پورے جوش وخروش سے یہ منوانے میں سرگرم رہتے ہیں کہ اس دور میں اسلام کا نفاذ اور غلبہ صرف اور صرف بذریعہ ''انتخابات'' یعنی جمہوری عمل کے ذریعے ممکن ہے...... بعض لوگ صرف قتال

وجہاد کے ذریعہ اسے ممکن سمجھتے ہیں، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ محض دین کی ناقص تبلیغ سے یہ مرحلہ سر کیا جا سکتا ہے...... جبکہ تنظیم اسلامی پورے جوش وخروش سے یہ منوانے میں اپنی صلاحیتوں اور اوقات کو ضائع کر رہی ہے کہ غلبہ اسلام صرف غیر مسلح تصادم یعنی ''احتجاجی سیاست'' کے ذریعے ممکن ہے۔ اور اس طریق کو دریافت کرنا اور اسے چند مزعومانہ ''ٹھوس'' دلائل سے مدون کرنا تنظیم اسلامی کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس زبانی جمع خرچ میں سب بے حد مگن اور بے حد مطمئن ہیں کہ وہ دین کی بہت بڑی خدمت سرانجام دے رہے ہیں جبکہ دین کا اصل کام اور دین کے اصل تقاضے...... افراد کا تزکیہ، کردار سازی، ایمان واخلاق کی آبیاری، قول وفعل کے تضاد کا قلع قمع، صالح افراد کی بنیاد پر صالح معاشرے کی تعمیر کا کام، جسے سید مودودیؒ نے خالص قرآنی فکر کے تحت بالکل درست طور پر ''عمومی تحریک اصلاح'' کے نام سے ذکر کیا ہے، اس کٹھن مگر نہایت بنیادی ومحوری کام سے ہم سب پہلوتہی کیے ہوئے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں ایمان واخلاق کی آبیاری، ذوق وشوق عبادت کی تربیت اور انذار وتذکیر بالقرآن پر اپنی صلاحیتوں کو مرکوز کر کے ایک مضبوط حفاظتی حصار کی تعمیر کے فریضہ کی پیہم، مسلسل اور مرکوز ادائیگی سے ہم، ہماری دینی ومذہبی قیادتیں اور جماعتیں غفلت اور تساہل برت رہی ہیں۔ یہ وہ بنیادی، اہم اور محوری فریضہ ہے جس کے بغیر قیامت تک نہ ہی اسلامی معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے اور نہ ہی غلبہ اسلام کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے۔ اور بالفرض اس کے بغیر کوئی نام نہاد اسلامی حکومت قائم ہو بھی گئی تو وہ چند ہی دنوں میں ریت کی دیوار ثابت ہوگی۔ یہ وہ کام ہے جو اسلامی حکومت قائم ہونے سے پہلے بھی ضروری ہے اور اس کے قائم ہو جانے کے بعد بھی اس کام کی اہمیت اور ضرورت کسی طرح کم نہیں ہوتی بلکہ اسلامی حکومت کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اس فریضہ اور وظیفہ کو ریاستی سطح پر بجالائے لیکن ہم، ہماری قیادتیں اور ہماری دینی جماعتیں احیائے اسلام کے لیے انبیاء ورسل کی اتباع کرنے کی بجائے، اس جانگسل اور کٹھن فریضہ کی مسلسل، پیہم اور مرکوز ادائیگی کرنے کی بجائے، اس بھاری پتھر کو چوم کر ایک طرف رکھ دیتی ہیں اور ''نفاذ اسلام کے لیے طریق کار'' کی مردہ، لایعنی اور بے کار بحثوں اور ''زبانی جمع خرچ'' میں اپنا اور اپنے پیروکاروں کا وقت برباد کر رہی ہیں۔ اس معاملہ میں تنظیم اسلامی کا رویہ باقی دینی جماعتوں کے مقابلہ میں اس لیے غلط تر ہے کہ تنظیم اسلامی اپنی اساسی تشخیص اور اساسی وبنیادی بیانات میں غیر مبہم اور ٹھوس الفاظ میں اس کا اعلان واظہار اس طرح کرتی ہے:

> ''آج ہم اللہ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی واجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری ممد ومعاون ہو۔

ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اسی کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح ونجات، دین کا اصل موضوع ہے اور پیشِ نظر اجتماعیت اصلاً اسی لیے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے‘‘۔

(تعارف تنظیم اسلامی صفحہ ۲۶ بعنوان ’’قراردادِ تاسیس‘‘)

تنظیم اسلامی کی اس قرارداد تاسیس کی وضاحت کرتے ہوئے عہد و پیماں باندھے گئے کہ:

’’آئندہ جو کام پیش نظر ہے اس کے اصول و مبادی میں یہ نکتہ بہت زیادہ قابل لحاظ رہے گا کہ ایک مسلمان کا اصل نصب العین صرف نجات اخروی اور رضائے الٰہی کا حصول ہے اور اس کے لیے اسے اصل زور اپنی سیرت کے تطہیر وتزکیے اور اپنی شخصیت کی تعمیر و تکمیل پر دینا ہوگا، ............ دین کی تائید و نصرت اور شہادت و اقامت یقیناً فرائض دینی میں سے ہیں لیکن ان کے لیے کوئی ایسی اجتماعی جدوجہد ہرگز جائز نہیں جو افراد کو ان کے اصل نصب العین سے غافل کر کے انہیں محض ایک دنیوی انقلاب کے کارکن بنا کے رکھ دے‘‘ (ایضاً صفحہ ۲۸ بعنوان ’’توضیحات‘‘)

اس قرارداد تاسیس کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی واضح کیا گیا کہ:

’’جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے وہ درحقیقت ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہی ہے۔ وہ خطرہ یہ ہے کہ جماعتیں اور تنظیمیں قائم تو ہوتی ہیں اصلاً کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لیے، لیکن قائم ہوجانے کے بعد آہستہ آہستہ وہ خود نصب العین اور مقصد بن جاتی ہیں اور اصل نصب العین غائب ہوجاتا ہے۔ آپ کو اس خطرے سے ہر قدم پر ہوشیار رہنا ہے۔ اس چیز نے نہ صرف جماعتوں اور تنظیموں کو تباہ کیا ہے بلکہ ملتوں اور امتوں کو بھی بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اس تغیر کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ اصل مقصد غائب ہوجاتا ہے بلکہ مقصد وسیلہ اور ذریعہ کا ایک ادنیٰ خادم اور چاکر بن کے رہ جاتا ہے۔ پھر تنظیم مقصد کی خدمت نہیں کرتی بلکہ مقصد کو اپنی خدمت اور اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی ہے۔ مذہب کے نام پر قائم ہونے والی جماعتوں کے لیے یہ چیز خاص طور پر خطرناک ہے اس لیے کہ جب اس طرح کی کوئی جماعت خود اپنے وجود اور اس کے قیام و بقا کو مقصود بنا لیتی ہے تو وہ مذہب کی بھی جن چیزوں کو اپنے اس مقصد کی راہ میں مزاحم پاتی ہے ان کو بدل کر اپنے جماعتی اغراض کے سانچہ میں ڈال لیتی ہے۔ مذاہب کی تاریخ ایک ساتھ شہادت دیتی ہے کہ اس چیز نے بے شمار تحریفات

کی راہیں کھولی ہیں اور اس سے بڑے بڑے فتنے ظہور میں آئے ہیں۔‘‘ (ایضاً صفحہ ۳۸)

اسی طرح ’’اسلام کی نشاۃ ثانیہ...... کرنے کا اصل کام‘‘ میں سابقہ اسلامی تحریکوں کی ناکامی کا تجزیہ کرتے ہوئے ’’احیائے اسلام کی شرط لازم...... تجدید ایمان‘‘ کے عنوان سے اسلامی تحریک کو اپنی صلاحیتیں ایمان کی آبیاری پر مرکوز کرنے کی طرف درج ذیل الفاظ میں متوجہ کیا گیا:

’’اسلام کی بنیاد ایمان پر ہے اور احیائے اسلام کا خواب ایمان کی عمومی تجدید کے بغیر کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ مسلمان ممالک کی سیاسی آزادی وخودمختاری بھی یقیناً بہت اہم ہے اور اس سے بھی ایک حد تک اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلامی نظام زندگی کا تصور اور اس پر ایک نظام حیات ہونے کے اعتبار سے اعتماد بھی ایک حد تک مفید اور قابل قدر ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ پیدا ہوا ہے یا ہو رہا ہے ان کی سعی وجہد بھی احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ لیکن اصل اور اہم تر کام ابھی باقی ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ عالم اسلام کے تمام سوچنے سمجھنے والے لوگ اس امر کی جانب متوجہ ہوں اور جنہیں اس کی اہمیت کا احساس ہو جائے وہ اپنی تمام تر سعی وجہد کو اس پر مرکوز کر دیں کہ امت میں تجدید ایمان کی ایک عظیم تحریک برپا ہو اور ایمان نرے اقرار اور محض قال سے بڑھ کر حال کی صورت اختیار کر لے۔

............ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ جب تک امت کے ایک قابل ذکر اور موثر حصے میں نقطہ نظر کی یہ تبدیلی واقعتاً پیدا نہ ہو جائے ’’احیائے اسلام‘‘ کی آرزو ہرگز شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے گی‘‘ (اسلام کی نشاۃ ثانیہ...... کرنے کا اصل کام صفحہ ۱۷، ۱۸)

لیکن افسوس صد افسوس! ان نہایت واضح اور صاف وشفاف اساسات سے تمسک کرنے اور انہی بنیادوں پر جماعت کی اجتماعی تنظیم کرنے کی بجائے رفتہ رفتہ اس سے نظریں چرالی گئیں اور ’’انقلاب اور طریق کار‘‘ کی لاطائل اور نہ ختم ہونے والی نظری بحثوں میں اپنے اوقات اور صلاحیتوں کو برباد کرنا شروع کر دیا گیا۔ اور جب مخلص رفقاء اور ساتھیوں نے قرآن حکیم اور تنظیم اسلامی ہی کی اساسات اور بنیادوں کی روشنی میں احیائے اسلام کی شرط لازم یعنی ایمان کی آبیاری، تزکیہ اخلاق اور تعمیر سیرت وکردار کے فریضہ سے غفلت برتنے کی طرف متوجہ کیا تو اپنے ہی اساسی وتشخیصی بیانات کو مسخ کرنے اور منطق کی خراد سے ان پر رندہ چلانے سے بھی گریز نہ کیا گیا۔ **فھل من مدکر**

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف

آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

سب سے بڑا المیہ اور سب سے بڑا بحران یہ ہے کہ تنظیم اسلامی جماعت اسلامی کی انتخابی سیاست میں شمولیت کے بے شمار حقیقی و فرضی نقصانات گنوانے کے باوجود خود تزکیہ قلوب، تعمیر سیرت، اصلاح فرد و معاشرہ اور دعوت الی اللہ کے معاملہ میں کوئی متاثر کن پیش رفت نہ کرسکی۔ بلکہ اس کے برعکس جماعت اسلامی اگر انتخابی سیاست کی عملی دلدل میں صلاحیتوں اور اوقات کو ضائع کرتی نظر آتی ہے تو تنظیم اسلامی بجائے اصلاح فرد و معاشرہ پر اپنی صلاحیتوں کو مرکوز کرنے کے غلبہ دین کے آخری مرحلہ میں اجتہاد کے ذریعے اپنے دریافت کردہ ''غیر مسلح تصادم'' نامی فلسفہ یعنی ''احتجاجی سیاست'' کو انقلابی طریق کار کا عنوان دے کر صبح وشام اس کی خوبیاں گنوانے اور اسے اپنا ایک بہت بڑا کارنامہ اور دریافت قرار دینے میں اوقات اور صلاحیتوں کو ضائع کرتی نظر آتی ہے۔ اور اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ ابھی تو ''احتجاجی سیاست'' کے حتمی مرحلے کا آغاز ہی نہیں ہوا تھا کہ تنظیم اسلامی کے کارکنان میں اخلاقی تنزل، سیرت و کردار کے بگاڑ، ضعف ایمان اور ضیاع و سہو عبادات میں بگٹٹ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اور جس رفیق نے بھی اس بگاڑ کی طرف سنجیدگی سے توجہ دلائی اور اس کی اصلاح پر صلاحیتوں کو مرکوز کرنے پر اصرار کیا۔ اسے بالآخر تنظیم بدری کے انجام سے دوچار ہونا پڑا۔

فرنگ میں کچھ دن اور ٹھہر تو جاؤں!
میرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ
مقام عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقام شوق میں کھویا گیا یہ فرزانہ